درس ۹

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب

اثباتِ آخرت کے لئے قرآن کا استدلال

سورۃ القیامہ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

اثباتِ آخرت کیلئے قرآن کا استدلال

سورۃ القیامہ کی روشنی میں

مدرس

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501

نام کتاب ــــــــــ اثبات آخرت کے لئے قرآن سے استدلال

طبع اول (نومبر ۱۹۹۹ء) ــــــــــ ۱۱۰۰

طبع دوم (جنوری ۲۰۰۲ء) ــــــــــ ۲۲۰۰

ناشر ــــــــــ ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت ــــــــــ ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰

فون: ۰۳-۵۸۶۹۵۰۱

مطبع ــــــــــ شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت ــــــــــ ۱۵ روپے

اثباتِ آخرت کیلئے قرآن کا استدلال

سورۃ القیامہ کی روشنی میں

مطالعۂ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار درس ان صفحات میں جاری ہے اس کا درس نہم سورۃ القیامہ پر مشتمل ہے۔ یہ سورۂ مبارکہ دو رکوعوں اور چالیس آیات پر مشتمل ہے اور قرآن حکیم کے انتیسویں پارے کے آخری ربع میں شامل ہے۔ مصحف کی ترتیب کے اعتبار سے اس سورۂ مبارکہ کا نمبر ۷۵ ہے۔

سورۃ التغابن پر ان دروس کی تکمیل ہو چکی ہے جن میں ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی ایمان باللہ' ایمان بالآخرہ اور ایمان بالرسالت کا بیان جامعیت کے ساتھ آیا ہے' لیکن چونکہ ہمارے دین کے اعتقادی نظام میں' یا یوں کہہ لیجئے کہ اسلام کی فکری و نظریاتی اساسات میں قیامت پر ایمان اور آخرت پر یقین کو بہت اہمیت حاصل ہے' لہٰذا مناسب سمجھا گیا کہ ایک درسِ خاص اسی موضوع پر اس منتخب نصاب میں شامل کیا جائے' اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ قیامت اور آخرت کے موضوع پر قرآن حکیم کی نسبتاً چھوٹی سورتوں میں جامع ترین سورت سورۃ القیامہ ہے۔

آخرت پر ایمان کی خصوصی اہمیت

اس سے قبل کہ ہم اس سورۂ مبارکہ کے مضامین اور مطالب پر غور کریں' ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایمان بالآخرت کی اہمیت کے بارے میں چند تمہیدی باتیں نوٹ کر لی جائیں۔

قیامت اور آخرت پر ایمان کی اہمیت کا اندازہ قرآن مجید کے ہر پڑھنے والے کو بآسانی ہو جاتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ قرآن حکیم کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جس میں آخرت کا ذکر خفی یا جلی انداز میں موجود نہ ہو۔ چنانچہ مصحف کے ہر صفحے پر کسی نہ کسی

اسلوب سے بعث بعد الموت ' حشر و نشر ' حساب کتاب ' جزا و سزا اور جنت و دوزخ میں سے کسی نہ کسی کا ذکر لازماً موجود ہے۔

جن مقامات کا مطالعہ ہم اس سلسلۂ درس میں کر چکے ہیں اگر ہم ان کا سرسری جائزہ لیں تو بادنیٰ تامل نظر آ جائے گا کہ ان میں سے ہر ایک میں آخرت کا ذکر موجود ہے۔ ہمارا پہلا درس سورۃ العصر پر مشتمل تھا۔ اس میں ایک جامع اصطلاح کے طور پر "ایمان" کا ذکر آیا' لیکن اس کی کوئی تفصیل نہیں تھی۔ البتہ دوسرے ہی درس میں' جو سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ پر مشتمل ہے اور جسے ہم نے "آیۂ بر" سے موسوم کیا تھا' ایمانیات کی تفصیل کے ضمن میں ایمان باللہ کے فوراً بعد یوم الآخر پر ایمان کا ذکر ہے : ﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ "بلکہ حقیقی نیکی تو اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور یومِ آخر پر۔"

ہمارا تیسرا درس سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع پر مشتمل تھا۔ اس میں ایک تو قانونِ مجازات و مکافاتِ عمل کا ذکر ہے جو بڑے جامع الفاظ میں حضرت لقمان کی وصیت میں آیا ہے :

﴿ يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۝ ﴾

(آیت ۱۶)

"اے میرے پیارے بچے! (اس حقیقت کو ذہن نشین کر لے کہ) انسان کے عمل کو (خواہ وہ نیکی ہو یا بدی) خواہ وہ رائی کے دانے کے ہم وزن ہو' پھر خواہ وہ کسی غار یا چٹان کے اندر چھپ کر کیا جائے' خواہ وہ فضاؤں اور خلاؤں میں جا کر یا زمین کی گہرائیوں میں اتر کر کیا جائے' اللہ اس کو (جزا و سزا کے دن) لے آئے گا۔ اور بے شک اللہ بہت باریک بین ہے' باخبر ہے۔"

اس کے علاوہ اسی رکوع میں ایک جگہ یہ الفاظ آئے : ﴿ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ ﴾ (آیت ۱۴) "میری ہی طرف لوٹنا ہے۔"

اگلی آیت کے آخر میں الفاظ آئے :

﴿ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ (آیت ۱۵)

"پھر میری ہی طرف تم سب کو آنا ہے' پھر میں تم سب کو جتلا دوں گا جو کچھ تم کرتے

رہے تھے۔"

ہمارا چوتھا سبق سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ پر مشتمل تھا' جس میں اہل ایمان کے لئے ان کی استقامت کا انعام جنت کی شکل میں دینے کا وعدہ فرمایا گیا اور اس ضمن میں ارشاد ہوا :

﴿ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ ﴾

(آیت ۳۱)

"اس میں تمہارے لئے وہ سب کچھ ہے جسے تمہارا جی چاہے اور تمہارے لئے وہ سب کچھ بھی ہو گا جسے تم طلب کرو گے"۔

پانچواں درس اساس القرآن سورۃ الفاتحہ پر مشتمل تھا' اس میں ایک عظیم آیت مبارکہ اسی حقیقت کبریٰ کے اظہار کے لئے وارد ہوئی' یعنی ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ ﴾ "جزاو سزا کے دن کا مالک۔"

چھٹا سبق سورۂ آل عمران کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵ پر مشتمل تھا' اس میں آپ نے دیکھا کہ کس شدّ و مدّ کے ساتھ آخرت کا ذکر آیا :

﴿ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ ﴾

(آیت ۱۹۱'۱۹۲)

"اے ہمارے ربّ! تُو نے یہ سلسلۂ کون و مکاں فضول اور بیکار پیدا نہیں کیا ہے' تُو پاک ہے' منزّہ ہے اس سے کہ کوئی بے مقصد اور عبث کام کرے' پس اے ہمارے آقا! ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے۔ یقیناً جس کو تُو نے دوزخ میں ڈال دیا اسے تو بالکل ذلیل اور رسوا کر دیا اور ایسے ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں ہو گا۔"

ذرا آگے چل کر الفاظ آئے : ﴿ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ "اور (اے ہمارے ربّ!) ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کیجیو"۔ پھر مزید آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے اپنے فرماں بردار بندوں کو ان الفاظ میں اطمینان دلایا :

﴿ لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

الْاَنْھٰرُ ﴾ (آیت ۱۹۵)

"میں لازماً ان کی برائیاں ان سے دُور کردوں گا اور ان کو لازماً ان باغات میں داخل کروں گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہیں۔"

اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قیامت کے وقوع اور اُخروی جزاو سزا کے یقینی ہونے پر کتنا زور ہے۔

اس کے بعد درس ہفتم یعنی سورۂ نور کے پانچویں رکوع میں قیامت کے دن کی ہولناکی کا نقشہ ان الفاظ میں سامنے آیا :

﴿ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ ۝ ﴾ (آیت ۳۷)

"(اللہ کے نیک اور محبوب بندے) لرزاں و ترساں رہتے ہیں' اس دن کے خیال سے جس دن دل اور آنکھیں الٹ جائیں گے۔"

درس ہشتم یعنی سورۂ تغابن میں تو بلاشک و شبہ یہ مضمون اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا' چنانچہ اس سورۂ مبارکہ کی تیسری آیت ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے :﴿ وَ اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ ۝ ﴾ "اور اسی (اللہ) کی طرف لوٹ جانا ہے۔" پھر ساتویں آیت میں پہلے تو منکرینِ قیامت کا یہ اعتراض یا مُغالطہ نقل کیا گیا :

﴿ زَعَمَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ یُّبْعَثُوْا ؕ ﴾ (آیت ۷)

"ان منکرین کو یہ مُغالطہ لاحق ہو گیا ہے کہ انہیں اٹھایا نہ جائے گا۔"

پھر نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا گیا :

﴿ قُلْ بَلٰی وَ رَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ ﴾ (آیت ۷)

"(اے نبی!) کہہ دیجئے : کیوں نہیں! مجھے میرے پروردگار کی قسم ہے کہ تم لازماً اٹھائے جاؤ گے اور پھر تمہیں لازماً جتلا دیا جائے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔"

اور ذرا آگے چل کر فرمایا :

﴿ یَوْمَ یَجْمَعُكُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ یَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ ﴾ (آیت ۹)

"جان لو کہ وہ دن' جس دن وہ تمہیں جمع کرے گا جمع ہونے کے دن ــــــ وہ ہے اصل ہار جیت کے فیصلے کا دن!"

یعنی اس روز جو کامیاب قرار دیا گیا وہی اصلاً کامیاب و کامران ہوا۔ پھر اس کامیابی کی

وضاحت ان الفاظ میں فرمائی گئی کہ :

﴿ ... يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ (آیت ۹)

"....اللہ اس کے گناہ جھاڑ دے گا اور اس کو ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی' یہ لوگ ان میں ہمیشہ رہیں گے' اور یہی دراصل بڑی کامیابی ہے۔"

اس کے برعکس جو ناکام قرار پائے گا اور نامراد رہے گا اس کے انجامِ بد کا بیان اگلی آیت میں وارد ہوا :

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ (آیت ۱۰)

"اور جن لوگوں نے کفر و انکار کا راستہ اختیار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلاتے رہے وہی لوگ دوزخ والے ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے' اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔"

اس سرسری سے جائزہ سے اندازہ ہو گیا کہ اب تک ہم نے جن معدودے چند مقامات کا مطالعہ کیا ہے ان میں بھی کس قدر شدّ و مدّ کے ساتھ بعث بعد الموت' قیامِ قیامت اور آخرت کی کامیابی اور ناکامی کا ذکر آچکا ہے۔

یہاں ایک نکتہ اور بھی نوٹ کر لیا جائے کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر یہ اہم تقابل سامنے آتا ہے کہ جہاں دوسرے ایمانیات کے لئے لفظ ایمان آیا ہے' وہاں آخرت کے لئے عموماً لفظ یقین استعمال ہوا ہے' جیسے سورۃ البقرۃ کے آغاز میں وحی الٰہی اور کتب سماویہ پر ایمان کا ذکر تو ان الفاظ میں آیا کہ :

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ ﴾

(آیت ۴)

"اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اس پر بھی جو (اے نبیؐ!) آپ پر نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا۔"

لیکن آخرت پر ایمان کا ذکر ہوا ان الفاظ کے ذریعے کہ :

﴿ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ○ ﴾ (آیت ۴)

"اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان بالآخرت میں وہ گہرائی اور شدت مطلوب ہے جسے ہم "یقین" سے تعبیر کرتے ہیں!

یہ بات پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ اصولی' نظری اور علمی اعتبار سے ایمان اصل میں نام ہے ایمان باللہ کا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ "ایمانِ مجمل" میں صرف ایمان باللہ کا ذکر ہے :

آمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیعَ اَحْکَامِہٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ

"میں ایمان لایا اللہ پر جیسے کہ وہ اپنے اسماء اور صفات سے ظاہر ہے' اور میں نے قبول کئے اس کے جملہ احکام' میں اقرار کرتا ہوں زبان سے اور تصدیق کرتا ہوں دل سے۔"

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسالت دونوں ایمان باللہ کی فروع ہیں۔ چنانچہ ایمان بالآخرت اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کا مظہر ہے اور ایمان بالرسالت اللہ تعالیٰ کی صفت ہدایت کا تکمیلی ظہور ہے' لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اگر عملی اور اخلاقی اعتبار سے غور کیا جائے تو سب سے مؤثر ایمان' ایمان بالآخرت ہے' اس لئے کہ اگر آخرت کا یقین ہو گا' مرنے کے بعد محاسبہ کے لئے جی اٹھنے کا یقین ہو گا' جزا و سزا کا یقین ہو گا' جنت و دوزخ کا یقین ہو گا تو انسان کے رویے میں عملی تبدیلی لازماً آئے گی اور اگر ایمان بالآخرت میں کمی رہ گئی تو ایمان باللہ بھی ذات و صفات باری تعالیٰ کی ایک علمی بحث بن کر رہ جائے گا اور ایمان بالرّسالت بھی عشقِ رسول ﷺ کے محض زبانی دعوؤں کی صورت اختیار کر لے گا اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور اتباع کی نوبت نہیں آئے گی۔

اس مقام پر ضمناً یہ بھی جان لیجئے کہ قانونی' فقہی اور شرعی اعتبار سے اہم ترین ایمان' ایمان بالرسالت ہے۔ چنانچہ ایمان باللہ اُسی وقت معتبر ہو گا جبکہ اللہ تعالیٰ کو ان اسماء و صفات کے ساتھ مانا جائے جن کی خبر حضرت محمد ﷺ نے دی ہے اور ایمان بالآخرت بھی تب ہی معتبر

ہوگا جب بعث بعدالموت' حشر و نشر' حساب کتاب' وزنِ اعمال' جزا و سزا اور جنت و دوزخ کی ان تفاصیل کو مانا جائے جن کی خبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے دی ہے۔

اس بات پر زور دینے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ بدقسمتی سے کچھ عرصہ سے ہمارے یہاں خود کو مسلمان کہلانے والا عقلیت زدہ لوگوں کا ایک مختصر سا گروہ یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے کہ آخرت حقیقی اور واقعی نہیں ہے بلکہ محض ایک نظریہ اور تصور ہے جس سے اصل مقصود دُنیا میں عدل و انصاف کا قیام ہے' چنانچہ جنت و دوزخ اور جزا و سزا کا جو تصور قرآن مجید دیتا ہے اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ اس دُنیا میں انسان کی معاشرتی' سماجی' سیاسی' معاشی الغرض پوری اجتماعی زندگی عدل و قسط پر قائم ہو جائے اور انسان دُنیا میں امن و سکون کے ساتھ بہتر سے بہتر طریق پر زندگی بسر کر سکے۔ یہ خیال اپنی اصل کے اعتبار سے خالص گمراہی اور زندقہ ہے۔ آخرت ہرگز صرف تصور اور محض نظریہ نہیں ہے بلکہ ایک واقعہ ہے جو لازماً ظہور پذیر ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف اسالیب سے اس بات پر زور دیا گیا ہے' جیسے مثلاً سورۃ الذاریات میں فرمایا : ﴿ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ۝ ﴾ (آیت ۵'۶) "جس (قیامت و آخرت) کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ بالکل برحق ہے (سچ ہے) اور جزا و سزا لازماً واقع ہو کر رہے گی" یا جیسے سورۃ المرسلات میں فرمایا : ﴿ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝ ﴾ (آیت ۷) "جس چیز کی دھمکی تمہیں دی جا رہی ہے وہ لازماً واقع ہو کر رہے گی۔" (یعنی نری دھمکی اور خالی دھونس نہیں ہے!)

جو لوگ آخرت کو محض ایک تصوّر اور نظریہ قرار دے کر یہ امید بھی کرتے ہیں کہ اس سے اس دُنیا میں عدل و قسط پر مبنی ایک اجتماعی نظام وجود میں آ سکتا ہے وہ ایک شدید مغالطے میں مبتلا ہیں۔ اس لئے کہ محض تصوّر و نظریہ سے یہ مقصد ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔ انسان کی سیرت' اس کے کردار' اخلاق اور اعمال و معاملات پر واقعی اور عملی اثر محض آخرت کے تصوّر یا نظریہ کا نہیں بلکہ صرف یقین کے درجے تک پہنچے ہوئے ایمان ہی کا پڑ سکتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک معاشرے میں آخرت پر قلبی یقین رکھنے والے لوگ معتدبہ تعداد میں موجود ہوں گے تو اس کی برکت سے اور اس کے نتیجے میں اس دنیا میں مبنی بر عدل و قسط اجتماعی نظام بھی لازماً وجود میں آئے گا' لیکن ایمان بالآخرت کا اصل

مقصود صرف ہماری دُنیوی بہبود نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مطلوب محاسبہ اُخروی میں سرخرو اور کامیاب و کامران ہونا ہے اور یہ نصب العین ہماری دُنیوی فلاح و بہبود اور امن و سلامتی سے اس طرح مربوط و متعلق ہے کہ آخرت کی وہ تفاصیل جو قرآن اور حدیثِ رسولؐ میں بیان ہوئی ہیں ان پر قلبی یقین اور اس کے مطابق اس دُنیا میں اپنے رویئے اور عمل کی اصلاح و تعمیر کے بغیر نہ دُنیا میں نظامِ عدل و قسط قائم ہو سکتا ہے اور نہ اُخروی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ الغرض یومِ قیامت ایک اٹل اور شُدنی امر ہے اور آخرت ایک حقیقتِ کبریٰ ہے اور اس کا حتمی اور یقینی علم اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور اپنی کتابوں کے ذریعے سے ہمیں پیشگی عطا فرمادیا ہے تاکہ ہمارے تمام اعمال کا اصل محرک اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول اور اُخروی نجات بن جائے' جس کے لئے قرآن حکیم دو ٹوک انداز میں ہمیں آگاہ اور متنبہ کرتا ہے :

﴿ فَإِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ○ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعٰى ○ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ○ فَأَمَّا مَنْ طَغٰى ○ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ○ فَإِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ○ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ○ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ○ ﴾ (النّٰزعٰت : ۳۴-۴۱)

"پس جب قیامت کا ہنگامۂ عظیم برپا ہو گا' اور جو کچھ انسان نے دُنیا میں کیا ہے اس دن وہ اس کو یاد کرے گا' اور دوزخ ہر دیکھنے والے کے سامنے بے نقاب کر دی جائے گی' تو جس نے دُنیا میں سرکشی کی تھی اور دُنیا کی زندگی کو آخرت پر مقدم رکھا تھا' اس کا ٹھکانہ تو بس دوزخ ہی ہے' اور جو اپنے رب کے حضور محاسبہ کے لئے پیشی سے ڈرا تھا اور اپنے نفس کو بُری خواہشات سے روکتا رہا تھا تو لاریب اس کا ٹھکانہ جنت ہے"۔

انکارِ آخرت کی مختلف صورتیں

یہ بات بھی جان لیجئے کہ انکارِ قیامت اور انکارِ آخرت کی متعدد شکلیں قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں۔ چنانچہ منکرین کا ایک استبعاد اور استعجاب تو وہ ہے جو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف اسالیب سے بیان ہوا ہے' اس کی صرف دو مثالیں پیش کرنے پر

اکتفا کیا جاتا ہے۔ سورۂ ق میں فرمایا :

﴿ ءَ اِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝ ﴾ (آیت ۳)

"(یہ کافر کہتے ہیں) کیا جب ہم مرجائیں گے اور مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گے (تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے ؟) یہ لوٹنا بہت دور کی بات ہے۔"

سورۂ یٰس میں جسے نبی اکرم ﷺ نے قرآن مجید کا قلب قرار دیا ہے' ارشاد ہوتا ہے :

﴿ اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۖ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ ﴾

(آیات ۷۷'۷۸)

"کیا انسان نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا' بایں ہمہ وہ کھلم کھلا جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا اور لگا ہماری نسبت باتیں بنانے اور اپنی اصل حقیقت کو بھول گیا' کہتا ہے کہ کون (آدمی کی) ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرے گا جبکہ وہ بوسیدہ ہو گئی ہوں!"

یہیں پر اگلی آیت میں فرمایا :

﴿ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۝ ﴾

(آیت ۷۹)

"(اے نبیؐ!) کہہ دیجئے کہ جس نے اِن کو اوّل بار پیدا کیا تھا وہی اِن کو دوبارہ زندہ کرے گا اور سب خلق اس کے علم میں ہے۔"

یہ تو منکرین کا استعجابی انداز سے انکار کا ذکر ہوا۔ ایک صاف اور صریح انکار بھی ہے کہ مرنے کے بعد کوئی جی اٹھنا نہیں ہے' کوئی آخرت نہیں ہے' زندگی بس اس دُنیا ہی کی زندگی ہے۔ اس کو الحاد اور دہریت کہا جاتا ہے۔ اور یہ نہ سمجھئے کہ یہ صرف عہدِ حاضر کی ضلالت ہے' اس خیال کے لوگ اس وقت بھی موجود تھے جب قرآن مجید نازل ہو رہا تھا' چنانچہ ان کا قول سورۃ الجاثیہ میں نقل ہوا ہے :

﴿ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ ﴾

(آیت ۲۴)

"اور وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے کوئی زندگی سوائے ہماری اس دُنیا کی زندگی کے' ہم

خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی جیتے ہیں اور ہمیں ہلاک کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے
سوائے گردشِ افلاک کے۔"

اس قول میں انکارِ آخرت ہی نہیں' اللہ کا انکار بھی بین السطور موجود ہے۔ یہ خالص الحاد ودہریت ہے جس کا پورا خلاصہ قرآن حکیم کی اس ایک آیت میں نقل کر دیا گیا ہے۔

انکار کی ایک تیسری شکل یہ ہے کہ نہ انکار ہو نہ اقرار' لیکن ظاہر ہے کہ اس کا عملی نتیجہ وہی نکلتا ہے جو صریح انکار کا! قرآن مجید میں یہ شکل بھی کچھ لوگوں کے اس قول کی صورت میں بیان ہوئی ہے کہ :

﴿ .... اِنْ نَّظُنُّ اِلاَّ ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ۝ ﴾ (الجاثية:۳۲)

"(آخرت کا) کچھ گمان سا تو ہوتا ہے کہ شاید واقع ہو' لیکن اس پر ہمارا دل نہیں ٹھکتا' (یقین حاصل نہیں ہوتا)۔"

ظاہر بات ہے کہ جب یہ شکل ہو گی تو انسان کا رویہ اور اس کا طرز عمل ان ہی لوگوں کے مشابہ اور مطابق ہو گا جو آخرت کو نہیں مانتے' اگرچہ منطقی طور پر یہ نہ صریح انکار ہے' نہ واضح اقرار!

سب سے زیادہ خطرناک صورت یہ ہے کہ بظاہر پورے طور پر اقرار موجود ہو لیکن اس کے ساتھ کچھ ایسی باتیں مانی گئی ہوں جن کے نتیجے میں یہ اقرار اور یہ ایمان بالآخرت بالکل غیر مؤثر ہو جائے اور اس کا انسان کے عمل اور اس کے اخلاقی رویے پر کوئی صحت مند اور صالح اثر مترتّب نہ ہو۔ اس کی بھی تین شکلیں قرآن حکیم میں بیان ہوئی ہیں۔

سب سے پہلے شفاعتِ باطلہ کا تصور ہے کہ آخرت ہو گی تو سہی' لیکن ہماری کچھ دیویاں اور دیوتا ہیں' یا کچھ مقربینِ بارگاہِ خداوندی ہیں جو ہمیں وہاں سے چھڑا لیں گے :
﴿ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ (یونس:۱۸) "یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی بنیں گے۔" ظاہر ہے کہ اس شکل میں بھی آخرت کا ماننا نہ ماننا برابر ہو گیا۔ واضح رہے کہ یہاں شفاعت باطلہ کا ذکر کیا جا رہا ہے' نہ کہ اُس شفاعت حقہ کا جس کا ثبوت قرآن اور حدیث دونوں سے ملتا ہے اور جو تین شرائط سے مشروط ہے ــــــ یعنی اوّلاً یہ کہ یہ اسی کی جانب سے ہو گی جسے بارگاہِ خداوندی سے اِذن مل جائے' پھر اسی کے حق میں ہو گی جس کے لئے اجازت ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مبنی بر حق و انصاف ہو گی' نہ کہ عدل و قسط کے

تقاضوں کو پامال کرنے والی۔

قرآن حکیم میں آخرت کے اس انکار مع الاقرار کی دوسری شکل یہ بیان ہوئی ہے کہ کچھ مرفّہ الحال اور دولت مند لوگ اپنی دولت مندی اور آسودہ حالی کو اپنے اس زعم کی دلیل بنالیتے ہیں کہ ہم تو اللہ کے چہیتے ہیں' لہٰذا ہم پر اس دُنیا میں بھی اللہ کا فضل ہو رہا ہے' چنانچہ اس نے ہمیں یہاں دولت دی ہے' شرف و عزّت سے نوازا ہے' لہٰذا اگر آخرت واقع ہو ہی گئی تو وہاں بھی ہم شرف و عزّت پائیں گے' قطع نظر اس سے کہ ہمارے اعمال کیا ہیں! سورۂ کہف میں دو افراد کے مکالمہ کے ضمن میں ایک ایسے ہی بر خود غلط شخص کا قول نقل ہوا ہے کہ :

﴿ وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝ ﴾ (آیت ۳۶)

"(اوّل تو مجھے یقین ہی نہیں ہے کہ اللہ کی طرف لوٹنا ہے) لیکن اگر بالفرض مجھے اپنے پروردگار کی طرف لوٹا ہی دیا گیا تب بھی اس نے جو کچھ مجھے یہاں دیا ہے وہاں وہ مجھے اس سے بھی بہتر دے گا۔" (آیت ۳۶)

یہی بات سورۂ حٰمٓ السّجدۃ میں ایک دوسرے اسلوب سے بیان فرمائی گئی ہے۔ وہاں ارشاد ہوتا ہے :

﴿ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ۡ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝ ﴾

(آیت ۵۰)

"(انسان کا حال یہ ہے کہ) ہم جب اسے اپنی رحمت سے (آسودگی سے) نوازتے ہیں تو کہنے لگتا ہے کہ یہ تو میرا حق ہے ہی' رہی قیامت تو اوّل تو مجھے یہ گمان اور اندیشہ ہے ہی نہیں کہ وہ واقع ہونے والی ہے' تاہم اگر مَیں اپنے ربّ کی طرف لوٹا ہی دیا گیا تو بھی میرے لئے وہاں اچھائی ہی اچھائی ہوگی۔"

اس انکار مع الاقرار کی تیسری و آخری شکل جو سب سے زیادہ لطیف لیکن اتنی ہی زیادہ خطرناک بھی ہے' یہ ہے کہ شیطان انسان کو اللہ کی شانِ رحیمی اور شانِ غفاری کے حوالے سے دھوکہ دیتا ہے کہ وہ بڑا بخشن ہار ہے' بڑا نکتہ نواز ہے' لہٰذا وہ تمہیں معاف کر

ہی دے گا۔ سورۃ الحدید میں تفصیلاً ذکر ہے کہ آخرت میں منافقین پکار پکار کر اہل ایمان سے کہیں گے کہ کیا ہم دُنیا میں تمہارے ساتھ بحیثیتِ مسلمان شامل نہ تھے' پھر یہاں ہمیں تم سے کیوں جُدا کر دیا گیا؟ تو اہل ایمان سے جواب دلوایا جائے گا کہ تم بظاہر تو مسلمان تھے لیکن اعمال کے اعتبار سے اور ایمان' بالخصوص ایمان بالآخرت کے لحاظ سے تم نے اپنے آپ کو ریب و تشکک اور تربّص و تردّد میں مبتلا کر رکھا تھا۔ آیتِ مبارکہ کے آخری الفاظ ہیں :

﴿ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝ ﴾

(آیت ۱۴)

"اور تم کو تمہاری تمنّاؤں (پر مبنی مَن گھڑت خیالات) نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ پہنچا (یعنی مہلتِ عمر تمام ہوئی) اور تمہیں خوب دھوکہ دیا اللہ پر (یعنی اس کی شانِ رحیمی و غفاری کے حوالے سے) اس بڑے دھوکہ باز (یعنی شیطان لعین) نے!"

مزید برآں آخری پارے کی ایک عظیم سورۃ یعنی سورۃ الانفطار کا تو مرکزی مضمون یہی ہے کہ ﴿ يٰاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝ ﴾ "اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے ربِ کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔" اس لئے کہ جہاں وہ کریم ہے' رحیم ہے' غفور ہے وہاں وہ عادل و منصف بھی ہے اور "قَائِمٌۢ بِالْقِسْطِ" بھی' اور "شَدِيْدُ الْعِقَابِ" بھی ہے اور "سَرِيْعُ الْحِسَابِ" بھی! حتیٰ کہ "عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ" بھی ہے' یعنی زبردست اور شدید انتقام لینے والا۔ (اے اللہ! ہم تیری اس شانِ انتقام سے تیری ہی رحمت کے دامن میں پناہ کے طالب ہیں!)

پس انکارِ آخرت کی یہ مختلف شکلیں ہیں۔ یہاں ان کا اختصار کے ساتھ تجزیہ اس لئے کر دیا گیا ہے کہ ہم بھی اپنے ذہنوں کا بھرپور جائزہ لیں اور اپنے دلوں کو ٹٹولیں۔ مبادا ہمارے قلوب و اذہان اور فکر و نظر میں بھی اس قسم کے بے بنیاد وسوسوں اور موہوم خیالات کا عکس موجود ہو اور کہیں ایسا نہ ہو کہ بظاہر ہم مطمئن ہوں کہ ہم آخرت کے ماننے والے ہیں لیکن غیر محسوس طور پر ہمارے تحت الشعور میں اس قسم کے مغالطے موجود ہوں جن کا اس درس میں ذکر کیا گیا ہے۔

یہ تمام باتیں جو اب تک پیش کی گئی ہیں، تمہیدی نوعیت کی ہیں۔ البتہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور اہم بات بھی اس موقع پر اجمالاً عرض کر دی جائے اور وہ یہ کہ قیامت سے مراد کیا ہے؟ اس دُنیا کا خاتمہ یا پوری کائنات کا خاتمہ؟؟ اس ضمن میں قرآن حکیم میں تین مراحل کا ذکر آتا ہے۔ ایک اس دُنیا اور اس کے نوامیس و قوانین کے خاتمے کا مرحلہ ہے۔ دوسرا بعث بعد الموت کا مرحلہ ہے جس سے حیاتِ اُخروی کا آغاز ہو گا اور جزا و سزا کے فیصلے نافذ ہوں گے۔ تیسرا اس پوری کائنات کے آخری انجام کا مرحلہ ہے۔ تدبّرِ قرآن کے ضمن میں یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ قرآن حکیم زیادہ تر گفتگو پہلے دو مرحلوں کے بارے میں کرتا ہے۔ تیسرے مرحلے کے بارے میں کوئی تفصیلی وضاحت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے، چنانچہ اس کے بارے میں ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے! پہلے مرحلے کو قرآن مجید بہت سے ناموں سے موسوم کرتا ہے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ کثیر الاستعمال لفظ "السَّاعَةُ" ہے، یعنی وہ متعین گھڑی جب ایک بڑی ہل چل مچے گی، ایک بہت بڑی تباہی آئے گی، دُنیا کا موجودہ نظام درہم برہم ہو جائے گا، اجرامِ فلکیہ ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے اور پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کے مانند ہو جائیں گے۔ یہ نقشہ ہے "السَّاعَةُ" کا۔ اسی کو اَلْقَارِعَةُ، اَلْحَاقَّةُ، اَلطَّامَّةُ الْکُبْرٰی اور الصَّاخَّةُ وغیرہ جیسے الفاظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرا مرحلہ ہے بعث بعد الموت کا، جس کے بعد تمام اوّلین و آخرین اور کُل جِنّ و اِنس عدالتِ اُخروی میں حساب کتاب کیلئے پیش ہوں گے۔ قرآن حکیم کے متعدد مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ حشر کا وہ دن نہایت طویل بھی ہو گا اور حد درجہ ہولناک بھی، جیسے کہ سورۂ مزّمّل میں فرمایا: ﴿یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا۝﴾ "وہ دن جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔" اور ہمارے ایک سابقہ درس میں (سورۂ نور، آیت ۳۷) میں یہ الفاظ آچکے ہیں کہ ﴿یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْہِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ﴾ "وہ دن جب دل اور نگاہیں سب کے سب الٹ جائیں گے!" اس کے لئے بھی قرآن مجید میں متعدد الفاظ آتے ہیں، چنانچہ اسے "یَوْمُ الدِّیْنِ" بھی کہا گیا ہے اور "یَوْمُ الْفَصْلِ" بھی، پھر اسی کو "یَوْمُ التَّغَابُنِ" بھی قرار دیا گیا ہے اور "یَوْمُ الْحِسَابِ" بھی، لیکن اس کے لئے سب سے زیادہ کثیر الاستعمال نام "یَوْمُ الْقِیٰمَةِ" ہے، یعنی کھڑے ہونے کا دن، جس کی وضاحت ایک دوسرے مقام پر (سورۃ المُطفِّفین) میں ان الفاظ سے کی گئی ہے:

﴿ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (آیت ۶)

"وہ دن جس میں تمام انسان پروردگارِ عالم کے سامنے کھڑے ہوں گے!"

قرآن کا عمومی اسلوب' مکّی اور مدنی سورتوں کا فرق

سورۃ القیامہ کے بارے میں چند تعارفی اور تمہیدی باتوں کے بعد اب ہمیں اس سورۂ مبارکہ کے مطالب و مفاہیم پر غور کرنا ہے۔ اس مقصد کے لئے مناسب ہے کہ پہلے ایک نظر اس پوری سورت کے سلیس اور رواں ترجمہ پر ڈال لیں' جو حسب ذیل ہے :

"نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔ اور نہیں! مجھے قسم ہے نفس ملامت گر کی۔ کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں! ہم قادر ہیں اس پر کہ اس کی ایک ایک پور کو (ٹھیک جوڑ دیں اور) برابر کر دیں۔ بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) انسان اپنے فسق و فجور کو جاری رکھنا چاہتا ہے۔ پوچھتا ہے کب ہو گا قیامت کا دن؟ ـــــ تو جب نگاہ چندھیا جائے گی اور چاند بے نور ہو جائے گا ـــــ اور سورج اور چاند یکجا کر دیئے جائیں گے ـــــ تو اس دن کہے گا یہی انسان کہ کہاں ہے بھاگ جانے کی جگہ؟ ـــــ کوئی نہیں! کہیں ٹھکانا نہیں! اس روز تو تیرے ربّ ہی کے حضور میں جا ٹھہرنا ہے۔ اس روز جتلا دیا جائے گا ہر انسان کو ہر اُس چیز کے بارے میں جو اُس نے آگے بھیجی اور جو پیچھے چھوڑی۔ بلکہ انسان خود اپنے بارے میں (پورے طور سے) آگاہ ہے۔ خواہ وہ کتنے ہی بہانے بنائے۔ (اے نبی ﷺ!) آپ اس قرآن کے ساتھ تیزی سے اپنی زبان کو حرکت مت دیجئے کہ اسے جلدی سے حاصل کر لیں۔ تحقیق ہمارے ذمے ہے اس کو جمع کرنا بھی اور اس کو پڑھوانا بھی۔ پس جب ہم پڑھوائیں تو آپ اس پڑھنے کی پیروی کیجئے۔ پھر بلاشبہ ہمارے ہی ذمے ہے اس کی مزید تشریح اور توضیح بھی۔ کوئی نہیں! بلکہ (تمہارا اصل مرض یہ ہے کہ) تم لوگ دُنیا کی محبت میں گرفتار ہو۔ اور آخرت کو نظرانداز کر دیتے ہو! بہت سے چہرے اُس دن تروتازہ ہوں گے۔ اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوئے ـــــ اور بہت سے چہرے اُس دن سوکھے اور اداس ہوں گے اور یہ

گمان کر رہے ہوں گے کہ اب ان کے ساتھ کمر توڑ دینے والا سلوک ہونے والا ہے ـــــ کوئی نہیں! جب جان ہنسلیوں میں آ پھنسے گی' اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا؟ اور انسان یہ سمجھ لے گا کہ اب (دُنیا سے) جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جائے گی۔ اُس روز تیرے ربّ ہی کی طرف ہانکے جانا ہے۔ پس نہ اس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی' بلکہ جھٹلایا اور پیٹھ موڑلی۔ پھر چل دیا اپنے گھر والوں کی طرف اکڑتا ہوا۔ افسوس ہے تجھ پر' پس افسوس ہے تجھ پر۔ پھر افسوس ہے تجھ پر' پس پھر افسوس ہے تجھ پر ـــــ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے یونہی چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا نہیں تھا وہ منی کی ایک بوند جو ٹپکائی گئی؟ ـــــ پھر وہ تھا ایک لوتھڑا جسے اللہ نے بنایا اور سنوارا۔ پھر اسی میں سے بنا دیئے جوڑے' نر اور مادہ ـــــ کیا وہ ہستی اس پر قادر نہیں کہ مُردے کو زندہ کر سکے؟" (یقیناً اے ہمارے ربّ! تُو اس پر قادر ہے اور ہم اس پر گواہ ہیں!)

اس سورۂ مبارکہ کا جو مجموعی تأثر اور اس کے مضامین کا جو اجمالی نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں قیامِ قیامت اور جزا و سزا کے لئے مثبت استدلال کو تو صرف دو قسموں کی صورت میں بیان کر دیا گیا ہے' البتہ منفی طور پر منکرینِ قیامت کے مؤقف کا ابطال قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے اور ان کے اعتراضات اور دلائل کی قلعی کھول دی گئی ہے۔ چنانچہ ایک طرف ان کے استعجاب اور استبعاد کو دور کرنے کے لئے اللہ کی اس قدرتِ کاملہ کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے جس کا سب سے بڑا مظہر خود انسان کی اپنی پیدائش ہے اور دوسری طرف منکرین قیامت کی گمراہی کا اصل سبب بھی بیان کر دیا گیا اور ان کے مرض کی اصل تشخیص بھی کر دی گئی' یعنی حُبِّ عاجلہ (دُنیا کی محبّت) میں گرفتار اور فسق و فجور اور ظلم و تعدّی کا خوگر ہو جانا' جس کی بناء پر انسان حساب کتاب اور جزاء و سزا کے تصور تک سے بھاگتا ہے اور اس کبوتر کی مانند جو بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے' نہیں چاہتا کہ خواہ مخواہ قیامت' حشر و نشر' حساب کتاب اور جزاء و سزا کے تصور سے اپنے موجودہ عیش کو مکدّر کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان چاہے زبان سے کچھ کہے' اس کے انکارِ قیامت کا اصل سبب وہی ہے جو اس سورۂ مبارکہ میں ﴿بَلْ يُرِيْدُ

الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ○ ﴾ "بلکہ اصل بات یہ ہے کہ انسان اپنے فسق و فجور کو جاری رکھنا چاہتا ہے" اور ﴿ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ○ ﴾ "کوئی نہیں! بلکہ تم لوگ دُنیا کی محبت میں گرفتار ہو" کے الفاظِ مبارکہ میں بیان ہوا۔ ضمنی طور پر ایک نہایت لطیف پیرائے میں یہ حقیقت بھی کھول دی گئی کہ دعوتِ دین اور ابلاغ و تبلیغ حق' کہ تحصیلِ علم کے معاملے میں بھی "عجلت پسندی" مناسب نہیں ہے۔

یہ تو اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کا اجمالی تجزیہ ہوا۔ اب مناسب ہے کہ اس کے سلسلہ وار مطالعہ سے قبل قرآن حکیم کے عمومی اسلوب اور اس کی مکّی اور مدنی سورتوں کے مزاج کے فرق کے ضمن میں بعض باتیں بطورِ تمہید عرض کر دی جائیں جو ان شاء اللہ فہمِ قرآن بالخصوص تدبّرِ قرآن کے ضمن میں کلید کا کام دیں گی۔

قرآن مجید کے عمومی اسلوب کے بارے میں یہ بات جان لینی از حد ضروری ہے کہ قرآن حکیم عام دُنیوی تصنیفات کی مانند نہیں ہے۔ ہماری تصانیف اور تالیفات کا اپنا مخصوص انداز ہوتا ہے' ایک خاص ترتیب ہوتی ہے اور ایک معیّن نہج ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں ابواب ہوتے ہیں اور ہر باب میں مضمون کا ایک حصّہ مکمل ہو جاتا ہے' پھر اُس کو اگلے باب میں دہرایا نہیں جاتا۔ جو لوگ قرآن حکیم کو دُنیا کی عام تصنیفات و تالیفات پر قیاس کر کے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں دِقت کا سامنا بھی ہوتا ہے اور ناکامی بھی ہوتی ہے۔ اچھّی طرح جان لیجئے کہ نہ قرآن مجید عام تصانیف و تالیفات کی مانند ہے' نہ اس کی سورتوں کی حیثیت کتاب کے ابواب کی ہے' نہ یہ مجموعۂ مضامین یا مجموعۂ مقالات کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ قرآن حکیم کا اسلوب خطبہ کا ہے اور قرآن مجید کی سورتیں گویا کہ خطباتِ الٰہیہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے مصحف میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کو ہم "مجموعۂ خطباتِ الٰہیہ" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اب خطبہ کے اسلوب میں چند امور اس کے لازمی جزو کی حیثیت سے شامل ہوتے ہیں۔ ان امور کو سمجھ لیا جائے تو قرآن حکیم کے فہم میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔

پہلی بات یہ کہ جب کوئی شعلہ بیان خطیب کوئی خطبہ دے رہا ہو تو اس میں بار بار خطاب کا رخ بدلتا ہے' چنانچہ ابھی خطیب دائیں طرف مخاطب تھا اور گفتگو کر رہا تھا' پھر وہ بائیں جانب کے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا' اب وہ ان سے گفتگو کر رہا ہے۔ اسی طرح

اگرچہ اس کے مخاطب اس کے سامنے بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ ان سے گفتگو کر رہا ہوتا ہے لیکن کبھی یہ گفتگو صیغۂ حاضر و خطاب میں نہیں بلکہ صیغۂ غائب میں ہونے لگتی ہے' اور اس میں فصاحت و بلاغت کا ایک خاص رنگ اور تاثیر کی ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ موجود نہیں ہوتے' ان کو وہ موجود اور حاضر فرض کر کے ان سے صیغۂ خطاب و حاضر میں گفتگو شروع کر دیتا ہے اور دورانِ خطبہ یہ "تحویلِ خطاب" بار بار اور وقفہ وقفہ سے ہوتا رہتا ہے۔ مزید برآں خطبات میں عام طور پر مخاطبین کے اعتراضات کو نقل کئے بغیر اور ان کے سوالات کو بیان کئے بغیر اُن کے جوابات دے دیئے جاتے ہیں' اور ان جوابات کا اسلوب و انداز ایسا ہوتا ہے کہ مخاطبین خواہ وہاں موجود ہوں خواہ نہ ہوں اور ان تک وہ باتیں بعد میں روایۃً پہنچیں' خود جان لیتے ہیں کہ یہ باتیں فلاں اعتراض کے جواب میں کہی جا رہی ہیں اور یہ تشریحات فلاں مسئلہ کی وضاحت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا گیا تھا' خطبہ کے اس اسلوب و انداز کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو فہمِ قرآن میں بڑی مدد ملے گی۔ اور اگرچہ پورے قرآن کا اسلوب یہی ہے' تاہم بعض سورتوں میں یہ بہت نمایاں ہے۔ چنانچہ خطبہ کا یہ انداز اس سورۂ مبارکہ میں نہایت شدّت کے ساتھ نمایاں ہے۔ یہاں ساری گفتگو منکرینِ قیامت سے ہو رہی ہے' کبھی صیغۂ حاضر میں ان سے براہِ راست خطاب ہے' کبھی "الانسان" کے حوالے سے بصیغہ غائب گفتگو ہو رہی ہے۔ درمیان میں چند باتیں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کر کے فرما دی گئیں اور اس طرح تحویلِ خطاب کی نمایاں مثال سامنے آگئی۔ پھر خطاب کا رخ دوبارہ منکرینِ قیامت و آخرت اور مخالفین بعث بعد الموت کی طرف منتقل ہو گیا۔ لہٰذا خطابت کے اسلوب و انداز کے اعتبار سے یہ سورۂ مبارکہ اسلوبِ قرآنی کی نہایت اہم اور نمایاں مثال ہے۔

دوسری بات یہ کہ جیسے ایک اعلیٰ پائے کے خطیب کے ہر خطبے کا ایک مرکزی موضوع یا مرکزی خیال یا ایک عمود ہوتا ہے اور خطیب کی تمام گفتگو اس مرکزی خیال یا عمود کے گرد گھومتی ہے اور اگرچہ وہ تمہید کے طور پر یا مختلف دلائل و شواہد کے ضمن میں ایسے مباحث پر بھی اظہارِ خیال کرتا ہے جن کا بظاہر اس کے خطبہ کے عمود یا مرکزی مضمون سے

تعلق معلوم نہیں ہوتا لیکن جب وہ بحث کو سمیٹتے ہوئے گفتگو کو ختم کرتا ہے تو خطبے کے تمام اجزاء اس خطبے کے مرکزی موضوع یا عمود سے مربوط نظر آتے ہیں۔ تو جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید کی ہر سورت ایک خطبۂ خداوندی کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم کی ہر سورۂ مبارکہ کا اپنا معین مرکزی خیال' موضوع اور عمود ہے اور نہ صرف یہ کہ پوری سورت اس مرکزی خیال یا عمود کے گرد گھومتی ہے بلکہ جس طرح ایک حسین و جمیل ہار میں ہر موتی دوسرے موتی کے ساتھ منسلک ہوتا ہے اسی طرح سورت کی تمام آیات باہم بھی مربوط ہوتی ہیں اور بحیثیت مجموعی سورت کے مرکزی مضمون کے ساتھ بھی ان کا ربط قائم رہتا ہے۔

پھر یہی نہیں بلکہ یہ بھی ایک عظیم حقیقت ہے کہ مصحف جس ترتیب کے ساتھ ہمارے پاس موجود ہے اس میں بھی گہرا ربط موجود ہے اور اس کی تمام سورتیں بھی باہم مربوط اور ایک خاص ترتیب کے سلسلے میں منسلک ہیں۔ قرآن مجید کا ہر قاری اور ہر طالب علم جانتا ہے کہ قرآن کی نزولی ترتیب بالکل مختلف تھی' لیکن نبی اکرم ﷺ نے اللہ کے حکم اور حضرت جبرئیل کی رہنمائی میں جس ترتیب سے قرآن حکیم کو مرتب فرمایا اور اُمت کے حوالے کیا وہ یہی ہے جو ہمارے پاس موجود ہے اور یہ لوحِ محفوظ کی ترتیب کے عین مطابق ہے۔ گویا یہی قرآن کی ازلی و ابدی ترتیب ہے! اس حقیقت کو اصطلاحاً ان الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے کہ مصحف کی یہ ترتیب "توقیفی" ہے' یعنی جس کا علم نبی اکرم ﷺ کے بتانے پر موقوف ہے۔ اس لئے کہ مصحف کی یہ ترتیب خود آنحضور ﷺ نے اللہ کی اس ہدایت کے مطابق معین کی ہے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے سے آپؐ کو دی جاتی تھی۔ اب چونکہ اللہ حکیم ہی نہیں "اَحکم الحاکمین" ہے لہٰذا قرآن حکیم کا ایک نہایت گہرا اور معنی خیز باطنی نظم ہے' اگرچہ قرآن کے اس داخلی نظام اور باطنی نظم کا فہم آسان کام نہیں ہے بلکہ اس کی حکمتوں کے سمجھنے کے لئے بڑے عمیق غور و خوض اور گہرے تدبّر و تفکر کی ضرورت ہے' اور اگرچہ فہم قرآن کے اس پہلو پر بھی الحمد للہ ہر دَور میں مفید کام ہوتا رہا ہے لیکن قرآن مجید کے محاسن و عجائب' اس کے علوم و معارف اور اس کے حکم و عبر ایک اتھاہ سمندر کے مانند ہیں جو تاقیامِ قیامت کبھی ختم نہیں ہو گا۔

چنانچہ نظمِ قرآن کے ضمن میں بھی عہد حاضر کے ایک محقق قرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ

نے جن پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے ان کی جانب پہلے توجہ نہیں ہو سکی تھی اور یقیناً آئندہ بھی اس کے مزید پہلو روشن ہوتے رہیں گے' لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ جہاں تک انسانی زندگی کی عملی رہنمائی کا تعلق ہے اس کے نقطۂ نظر سے قرآن مجید نہایت سہل اور آسان کتاب ہے' جیسا کہ سورۃ القمر کی چار آیات (۱۷'۲۲'۳۲'۴۰) میں اللہ تعالیٰ نے بتکرار و اعادہ ارشاد فرمایا :

﴿ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ ﴾

"اور بلاشبہ ہم نے اس قرآن کو نصیحت اخذ کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے' تو ہے کوئی نصیحت پکڑنے والا؟"

تیسری بات ابتدائی مکی سورتوں کے مخصوص امتیازی اسلوب و انداز سے متعلق ہے۔ اس لئے کہ مکی دَور کے بھی آخری حصے میں جو سورتیں نازل ہوئیں' ان کا اسلوب ابتدائی مکیات سے مختلف اور مدنی سورتوں کے اسلوب سے مشابہ ہے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ یہ "رنگِ دگر" زیادہ پختگی اور گہرائی کے ساتھ مدنی سورتوں ہی میں ظاہر ہوتا ہے۔ ابتدائی مکیات اور بعد کی سورتوں کے مابین جو فرق و تفاوت ہے' اس کو یوں سمجھئے کہ ابتدائی مکی سورتوں میں خطابت کا رنگ اور انداز نہایت نمایاں اور بہت گہرا ہے۔ چنانچہ ان میں جوش و خروش بھی زیادہ ہے اور زجر و توبیخ اور انذار و تنبیہہ بھی اس انداز کی حامل ہے جس کی بابت حالی نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے کہ ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی

عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی!

چنانچہ اس کا کسی قدر اندازہ سورۂ قیامہ کے ترجمے ہی سے ہو جاتا ہے کہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شعلہ بیان خطیب نہایت پُر جلال اور پُر ہیبت انداز میں خطبہ دے رہا ہے۔

ابتدائی مکی سورتوں کا ایک دوسرا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان کی آیات چھوٹی چھوٹی ہیں' جبکہ بعد کی مکیات اور تقریباً تمام مدنی سورتوں میں آیات کا طول اور حجم مقابلتاً بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ ہم ایک فوری تقابل کر سکتے ہیں۔ یہ سورۂ قیامہ ہے جو ابتدائی مکی سورتوں میں سے ایک ہے جس کا ہم فی الوقت مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سے متصلاً قبل ہم نے سورۂ تغابن کا مطالعہ مکمل کیا ہے جو مدنی سورت ہے' وہ بھی دو رکوعوں پر مشتمل ہے

اور اس سورۂ قیامہ کے بھی دو رکوع ہیں۔ مصحف میں اگر آپ ان دونوں کے حجم کا تقابل کریں گے تو سورۂ قیامہ' سورۂ تغابن کے تین چوتھائی سے بھی کم ہے' لیکن سورۂ تغابن کی آیات کی تعداد اٹھارہ ہے اور سورۂ قیامہ کی آیات کی تعداد چالیس ہے۔ مزید برآں اکثر ابتدائی مکی سورتوں میں غنائیت اور ترنم بھی پایا جاتا۔ چنانچہ ان میں قوافی کا لحاظ بھی نمایاں ہے اور بہاؤ بھی تیز ہوتا ہے۔ اس طرح ایک جانب جوش و خروش اور دوسری جانب تیزی و روانی' ان دونوں کے امتزاج سے زبردست اثر انگیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تمام اوصاف ابتدائی مکی سورتوں میں بہت نمایاں ہیں جبکہ آخری دور کی مکیات اور بالخصوص مدنی سورتوں میں چند استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر آپ ایک مختلف انداز اور رنگ پائیں گے۔ چنانچہ ان میں آیات بھی طویل ہو گئی ہیں' بہاؤ بھی تیز نہیں ہے بلکہ مضمون بڑے پرُسکون انداز میں بالکل ایسے آگے بڑھتا ہے جیسے کوئی دریا بہہ رہا ہو۔ آیات کی طوالت کے باعث عام طور پر ان میں قوافی (فواصل) اور صوتی آہنگ کا بھی اتنا اہتمام نہیں رہتا جو ابتدائی مکیات کا خصوصی وصف ہے۔

سورۂ قیامہ کے حوالے سے قرآن حکیم کے عظیم معجزہ ہونے کا ایک یہ پہلو بھی بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ فصاحت و بلاغت کی معراج اور عربی زبان و ادب کا عظیم ترین شاہکار ہے۔ قرآن مجید کا عربی زبان پر یہ عظیم احسان تو بالکل ظاہر و باہر ہے کہ مختلف علاقائی "بولیوں" سے قطع نظر ادبی اور کتابی عربی کی روایت کا تسلسل اسی کے دم سے قائم و دائم ہے' اور اس طرح قرآن حکیم عربی زبان کو گویا ایک ستون کی مانند تھامے ہوئے ہے۔ چنانچہ اب بھی عربی ادب میں قرآن مجید کو بالکل وہی مقام حاصل ہے جو اس کے نزول کے وقت تھا' اور اس کی بنیاد کسی مذہبی عقیدے یا عصبیت پر قائم نہیں ہے' اس لئے کہ کثیر تعداد میں ایسے یہود و نصاریٰ آج بھی موجود ہیں جن کی مادری زبان عربی ہے اور اس کے باوجود کہ وہ قرآن حکیم کے اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہونے پر ایمان نہیں رکھتے لیکن بایں ہمہ وہ بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کی معراج اور عربی ادب کا شاہکار ہے اور قرآن مجید کے اس وصف کے بارے میں ان کو بھی کوئی اشتباہ نہیں ہے' اور اگرچہ یہ بات تو بہت تفصیل طلب ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایک مستقل اور وسیع موضوع ہے کہ قرآن حکیم کے اعجاز کے کون کون سے رُخ اور

کون کون سے پہلو ہیں اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ اس کے معانی' اس کے مطالب' اس کے مفاہیم' اس کا طرزِ استدلال' اس کی اثر انگیزی' اس کی علمی رہنمائی' اس کی رُوحانی و اخلاقی تعلیم' پھر انسان کے پیچیدہ ترین عمرانی اور تمدنی مسائل کا جو متوازن و معتدل حل یہ پیش کرتا ہے اور انسانی زندگی کے لئے جو کامل اور عدل و قسط پر مبنی دستور یہ عطا فرماتا ہے وہ سب اپنی جگہ اعجازِ قرآنی کے اہم اور عظیم مظہر ہیں اور جیسے جیسے زمانہ گزرے گا اور نئے نئے حالات و واقعات سامنے آئیں گے اعجازِ قرآنی کے یہ پہلو مزید اجاگر ہوں گے' لیکن اس میں بھی ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن کے نزول کے وقت اس کے اعجاز کا جو پہلو سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوا تھا وہ ہے اس کا اسلوب' ادبیت' خطابت' فصاحت' بلاغت' سلاست' حلاوت' تر و تازگی' چاشنی اور اس کا جوش و خروش! ـــــ اور اس کے یہ تمام محاسن تاحال اسی طرح آفتابِ عالم تاب کی مانند قائم ہیں اور بحمدِ اللہ قرآن حکیم کے بارے میں ہر صاحبِ ذوق جانتا ہے کہ آج بھی نبیؐ اکرم ﷺ کے یہ ارشادات صد فیصد درست اور ہر شائبہ شک سے پاک ہیں کہ : ((لَا یَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ' وَلَا یَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ' وَلَا تَنْقَضِی عَجَائِبُهُ)) یعنی "اہلِ علم اس سے کبھی سیر نہ ہو سکیں گے' اور اس پر کبھی باسی پن طاری نہیں ہو گا' نہ کثرت و تکرارِ تلاوت سے اس کے لطف اور اثر انگیزی میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات یعنی نئے نئے علوم و معارف کا خزانہ کبھی ختم ہو گا"۔ گویا یہ قرآن مجید اور فرقان حمید ہمیشہ اسی طرح تابندہ' پائندہ اور تر و تازہ کلام رہے گا جس طرح اپنے نزول کے وقت تھا اور اگرچہ قرآن مجید کے یہ ادبی محاسن اس کے ایک ایک لفظ میں نمایاں ہیں لیکن ان کا جس شدّت کے ساتھ ظہور ابتدائی مکّی سورتوں میں ہوا ہے اس کا ادراک اور شعور تو ہم غیر عرب عامیوں کو بھی بہت حد تک ہو جاتا ہے' اور چونکہ سورۃ القیامہ اس کی ایک نہایت نمایاں مثال ہے لہٰذا اس سورۂ مبارکہ کے ضمن میں اس تمہیدی گفتگو میں قرآن حکیم کے عمومی اسلوب اور بالخصوص ابتدائی مکی سورتوں اور بعد میں نازل ہونے والی سورتوں کے مابین انداز اور اسلوب کے فرق کی جانب یہ اشارات کر دیئے گئے۔ اب ہم اس سورۂ مبارکہ کا سلسلہ وار مطالعہ شروع کرتے ہیں۔

پہلی دو آیات: قیامت کے دن اور نفسِ ملامت گر کی قسم

﴿ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ ﴾

"نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی ـــــ اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی!!"

سورۃ القیامہ کی ابتدائی دو آیتوں میں واردشدہ قسموں میں اللہ تعالیٰ نے اس تمام استدلال کو کمال ایجاز و اعجاز کے ساتھ سمو دیا ہے جو اثباتِ آخرت اور وقوعِ قیامت کے ضمن میں طویل مکی سورتوں میں شرح و بسط اور اطناب و تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

ان دونوں قسموں کے نفس مضمون پر کلام سے قبل اس حرفِ نفی یعنی "لَا" کے بارے میں وضاحت مناسب ہے جو دونوں قسموں سے متصلاً قبل اور دونوں آیتوں کے شروع میں آیا ہے۔ یہ قرآن حکیم کا ایک خاص اسلوب ہے جو اس سورۂ مبارکہ کے علاوہ قرآن مجید کی چھ مزید سورتوں (الْوَاقِعَة' الْحَاقَّة' الْمَعَارِج' التَّكْوِيْر' الْاِنْشِقَاق اور الْبَلَد) میں بھی وارد ہوا ہے' اور اس کے بارے میں اگرچہ بعض دوسری آراء اور تاویلات بھی موجود ہیں' تاہم بہترین رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ یہ رسم الخط کے اعتبار سے تو "لاءِ متّصل" نظر آتا ہے' لیکن واقعتاً "لاءِ منفصل" ہے' یعنی حرفِ نفی "لَا" علیحدہ ہے اور "اُقْسِمُ" علیحدہ' لیکن چونکہ عربی زبان میں انگریزی کی طرح علامتیں اور اوقاف نہیں ہیں لہٰذا یہ فرقِ اسلوب بیان اور مضمون کے سیاق و سباق پر غور کرنے ہی سے سمجھ میں آتا ہے۔ اسے یوں بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ جب ایک خطیب خطبہ شروع کرتا ہے تو اس کے سامنے اس کے جو سامعین و مخاطبین ہوتے ہیں' ان کے ذہنوں میں کچھ اشکالات' اعتراضات اور سوالات ہوتے ہیں۔ چنانچہ خطیب ان کی تردید سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتا ہے اور کہتا ہے "لَا" یعنی ہرگز نہیں! تمہارے خیالات غلط ہیں' تمہارے اشکالات باطل ہیں' تمہارے اعتراضات بے وزن ہیں ـــــ اور پھر اپنے مؤقف کو بیان کرنے سے قبل اپنے یقین و اذعان کے اظہار کے لئے کوئی قسم کھاتا ہے جس کے لئے لفظ "اُقْسِمُ" استعمال کرتا ہے' جیسے یہاں قسم کھائی گئی۔ یعنی "میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی"۔ گویا قیامت اتنی یقینی' اتنی حتمی اور اتنی قطعی ہے کہ میں اس کی قسم کھا رہا ہوں۔ اسی طرح دوسری آیت پڑھئے: "اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ

ملامت کرکی"۔ یہ آغاز خود بتا رہا ہے کہ یہ انداز و اسلوب خطیبانہ ہے۔ جیسے ایک خطیب پہلے سے جانتا ہے کہ اس کے سامنے جو سامعین و حاضرین موجود ہیں اور اس کے جو مخاطبین ہیں' ان کے ذہنوں میں کیا کیا وسوسے' کیا کیا اشکالات اور کیا کیا اعتراضات ہیں' اور وہ کن کن وجوہ اور اسباب کی بنیاد پر قیامِ قیامت اور وقوعِ آخرت کو بالکل ناممکن اور بعید از قیاس سمجھ رہے ہیں۔ لہٰذا خطیب ان کے تمام اشکالات' اعتراضات اور وسوسوں کی نفی و تردید کے لئے لاء نفی سے اپنے خطبے کا آغاز کر رہا ہے۔

۱۔ قیامت کی قسم!

اور اب توجّہ کو مرتکز کیجئے ان دو قسموں کے نفسِ مضمون پر —— ان میں سے پہلی قسم ہے خود قیامت کے دن کی۔ گویا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ تمہارے ذہنوں میں شبہات و اشکالات ہیں' تمہارے دلوں میں وسوسے ہیں کہ دُنیا کے آغاز سے لے کر قیامِ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسان کیسے دوبارہ اٹھائے جاسکیں گے اور انہیں دوبارہ کیسے زندہ کیا جاسکے گا؟ پھر ان سب انسانوں کے جملہ اعمال و افعال اور وہ بھی جملہ تفصیلات کے ساتھ کہاں محفوظ ہوں گے؟ مزید برآں ان اعمال و افعال کی پشت پر کار فرما نیتیں اور ارادے کس کے علم میں ہوں گے؟ لہٰذا یہ محاسبہ اور جزاء و سزا کا معاملہ کیسے ظہور پذیر ہوسکے گا؟ لیکن یہ وقوعِ قیامت اس قدر یقینی' قطعی اور حتمی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "میں اس دن کی قسم کھاتا ہوں"۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اس میں دلیل کون سی ہے؟ اس لئے کہ اگر کوئی شخص کوئی دعویٰ پیش کرے اور اس سے اس دعوے کے لئے کوئی دلیل طلب کی جائے تو جواب میں وہ اس پر صرف قسم کھانے پر اکتفا کرے تو یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ عقلی اور منطقی اعتبار سے اس نے کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اسلوب اور اصول میں بھی ایک دلیل مضمر ہے' اور وہ دلیل ہوتی ہے خود متکلّم کی شخصیت کی۔ اگر کوئی صاحبِ کردار انسان جس پر اعتماد کیا جاتا ہو' جس کی صداقت کی گواہی دی جاتی ہو' جب وہ کوئی بات کہتا اور قسم کھا کر کہتا ہے تو اس کے قسم کھانے سے اس کی بات میں نمایاں وزن پیدا ہو جاتا ہے جو در حقیقت اور اصلاً اس شخص کی اپنی شخصیت کا ہوتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ یہاں قسم کھانے والا کون ہے! ان لوگوں کے

نزدیک جو قرآن مجید کو اللہ کا کلام تسلیم کرتے ہیں، قسم کھانے والا خود اللہ ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کو اللہ کا کلام ماننے والے صاحب ایمان پر تو اس کا لازمی اثر یہ پڑے گا کہ اس کا دل لرز جائے گا اور وہ کانپ اٹھے گا کہ قیامت کا دن اتنا یقینی، حتمی اور قطعی ہے کہ خود خالق کون و مکاں نے اس کی قسم کھائی ہے۔

رہے وہ لوگ جو قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہیں مانتے تو وہ بھی اس قسم کو لامحالہ منسوب کریں گے جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی طرف۔ اور اس صورت میں بھی اس قسم کی تاثیر ختم نہیں ہو گی بلکہ باقی رہے گی، اس لئے کہ حضور ﷺ کی شخصیتِ مبارکہ اور سیرتِ مطہرہ کا وزن اس کی پشت پر پھر بھی موجود رہے گا کہ یہ قسم وہ کھا رہا ہے جس کی صداقت و امانت کی گواہی اس کے دشمنوں تک نے دی ہے۔ یہ مضمون اس سے قبل سورۃ التغابن کی آیت نمبر ۷ کے الفاظ مبارکہ ﴿ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ﴾ "(اے نبیؐ!) کہہ دیجئے : کیوں نہیں! اور مجھے میرے ربّ کی قسم ہے کہ تم لازماً دوبارہ اٹھائے جاؤ گے اور پھر تم لازماً جتلا دیئے جاؤ گے جو کچھ تم (دُنیا میں) کرتے رہے ہو" کی تشریح و توضیح کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔ چنانچہ سیرتِ مطہرہ کا اہم واقعہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ اور اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابو جہل سے یہ پوچھا گیا کہ "کیا تمہارا گمان یہ ہے کہ محمدؐ جھوٹ بولتے ہیں" تو اس نے کہا "ہرگز نہیں! انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا" پھر جب پوچھنے والے نے پوچھا کہ "پھر تم ان کی تصدیق کیوں نہیں کرتے اور ان پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟" تو اس نے بڑی صفائی کے ساتھ اقرار کیا کہ "اصل معاملہ یہ ہے کہ ہمارے اور بنو ہاشم کے مابین ایک مسابقت اور مقابلہ جاری ہے۔ انہوں نے لوگوں کو کھانے کھلائے تو ہم نے ان سے بڑھ کر کھلائے، انہوں نے مہمان نوازیاں کیں تو ہم نے ان سے بڑھ کر کیں، ہم اب تک ان کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملائے چلے آ رہے ہیں۔ اب اگر ہم ان کے ایک فرد کی نبوت کو تسلیم کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم ہمیشہ کے لئے ان کے تابع ہو جائیں گے اور یہ بات مجھے کسی طور پر بھی گوارا نہیں"۔ معلوم ہوا کہ ابو جہل جیسا دشمن خدا اور رسولؐ بھی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ کا الزام نہیں لگا سکا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضور ﷺ کو حکم ہوا :

﴿ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ ﴾ (الحجر : ۹۴) "پس اب (اے نبیؐ!) آپ برملا اور ڈنکے کی چوٹ کہئے وہ بات جس کا آپؐ کو حکم ملا ہے"۔ اور آپؐ پہلے "خطابِ عام" کے لئے کوہِ صفا پر کھڑے ہوئے تو چونکہ اس زمانے میں رواج تھا کہ اگر کوئی اہم خبر لوگوں کو پہنچانی مقصود ہوتی تھی تو خبر پہنچانے والا کسی بلند مقام پر بے لباس ہو کر کھڑا ہو جاتا تھا اور نعرہ لگاتا تھا "وَا صَبَاحَا" (ہائے وہ صبح جو آنے والی ہے) چنانچہ لوگ اس کی آواز سن کر اور جن تک آواز نہیں پہنچتی تھی وہ دور سے یہ دیکھ کر کہ ایک "ڈرانے والا" پہاڑی پر کھڑا ہے' اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ لہٰذا حضور ﷺ نے اس رواج میں یہ ترمیم فرماتے ہوئے کہ کپڑے نہیں اتارے' اس لئے کہ یہ بات کسی طرح بھی آپؐ کے شایانِ شان نہ تھی اور آپؐ تو حیا کا پیکر اعظم تھے' باقی سارا معاملہ معمول کے مطابق کیا اور کوہ صفا پر کھڑے ہو کر باوازِ بلند فرمایا : "وَا صَبَاحَا"۔ اور جب آپؐ کی یہ ندا سن کر اور آپؐ کو کوہِ صفا پر کھڑا دیکھ کر لوگ آپؐ کے گرد جمع ہو گئے تو آپؐ نے دعوت پیش کرنے سے پہلے لوگوں سے سوال کیا "لوگو! تم نے مجھے کیسا پایا؟" مجمع نے بیک زبان تسلیم کیا کہ آپؐ سچے بھی ہیں اور امانت دار بھی! لہٰذا جو لوگ قرآن مجید کو منزل من اللہ نہیں مانتے اور ان کے نزدیک اس کلام کے متکلم خود محمد (ﷺ) ہیں' ان کے لئے حضور ﷺ کی شخصیت کا پورا وزن اور پورا زور اس قسم کی پشت پر موجود ہے کہ ﴿ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ﴾ "کیوں نہیں! مجھے قسم ہے قیامت کے دن کی"۔ یعنی میں قیامت کے وقوع کو اتنا یقینی' قطعی اور حتمی مانتا ہوں کہ اس کے یقین اور شدنی ہونے پر خود اس ہی کی قسم کھاتا ہوں!

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے سورۃ التغابن کی آیت نمبر ے میں نبی اکرم ﷺ سے جو قسم کہلوائی گئی تھی اس کا بھی یہی مفاد اور انداز تھا۔ اصطلاح میں اس کو "دلیل خطابی" کہا جاتا ہے جس میں دلیل کی حیثیت متکلم کے اپنے یقین واثق اور اس کی اپنی بے داغ شخصیت اور اعلیٰ سیرت کو حاصل ہوتی ہے اور جس کے ذریعے متکلم کا یقین اور اذعان مخاطبین میں منتقل ہوتا اور سرایت کرتا ہے۔

۲۔ نفس ملامت گر کی قسم!

اب آیئے دوسری دلیل کی طرف۔ ارشاد فرمایا گیا : ﴿ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ

اللَّوَّامَةِ ۝﴾ "اور کیوں نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی"۔ اس بات کو ایک آفاقی و عالمی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ انسان کے باطن میں ایک حقیقت پوشیدہ ہے جسے ضمیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انسان جب کوئی برا کام کرتا ہے تو اسے اندر سے ضمیر کی خلش کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اس لئے کہ بُرے سے بُرا انسان بھی یہ جانتا ہے کہ برائی برائی ہے اور بدی بدی ہے' اور اگرچہ مختلف اسباب اور محرکات کے تحت وہ کسی برائی کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے' لیکن عین اُس وقت بھی وہ یہ جانتا ہے کہ یہ کام بُرا ہے اور اسے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اس کا ضمیر اُسے اندر ہی اندر کچو کے دے رہا ہے۔

اسی احساس اور اسی کیفیت کو اس آیت مبارکہ میں "نفسِ لوّامہ" قرار دیا گیا ہے اور آیتِ مبارکہ میں اس کی قسم کھائی گئی ہے۔ اس لئے کہ نفسِ انسانی کی یہ مضمر حقیقت جو عالمی اور آفاقی سطح پر مسلّم سچائی کی حیثیت رکھتی ہے' وقوعِ قیامت پر سب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ مؤثر دلیل ہے' جسے قرآن حکیم نے اسلوب اور الفاظ کے فرق اور تنوع کے ساتھ بہت سے مقامات پر' کہیں اجمال اور کہیں تفصیل کے ساتھ' بیان کیا ہے۔

اس دلیل کا اگر کسی قدر تفصیلی تجزیہ کیا جائے تو بات کچھ یوں بنتی ہے کہ ہر انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے نیکی اور بدی کو پہچانتا ہے' ان میں تمیز کرتا اور ان کے فرق و تفاوت کو خوب جانتا اور پہچانتا ہے۔ گویا یہ پہچان اور یہ شعور فطرتِ انسانی میں ودیعت شدہ ہے۔ چنانچہ آخری پارہ کی سورۃ الشمس میں فرمایا گیا: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۝﴾ "اور گواہ ہے نفس انسانی اور جیسا کہ اسے بنایا اور سنوارا' پھر اس میں فجور و تقویٰ (برائی اور اچھائی اور بدی اور نیکی کا علم) الہامی طور پر ودیعت کر دیا"۔ چنانچہ ہر شخص جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا برائی ہے اور سچ بولنا اچھائی ہے' وعدہ خلافی برائی ہے اور ایفائے عہد بھلائی ہے' کسی کو دھوکہ دینا شر ہے اور کسی کی صحیح رہنمائی کرنا خیر ہے' ظلم و استحصال اور تعدی و حق تلفی بدی کے کام ہیں' جبکہ عدل و انصاف' ہمدردی و خیر خواہی اور خدمت خلق نیکی کے کام ہیں۔ یہ سب عالمی اور آفاقی سچائیاں ہیں اور ان کے ضمن میں کہیں بھی انسانوں کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اب اگر یہ حقیقت ہے' جیسی کہ وہ فی الواقع ہے' اس لئے کہ اس کے حقیقت

ہونے پر سب سے بڑا گواہ ہے ہمارا اپنا ضمیر' ہمارا اپنا نفس ملامت گر اور ہمارا اپنا ذاتی احساس کہ اگر کسی سبب سے ہم سے کوئی غلط حرکت سرزد ہو جاتی ہے یا کسی برے کام کا ارتکاب ہو جاتا ہے تو ہمارا اپنا ضمیر ہمیں ملامت کرتا ہے کہ تم نے یہ برا کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان معدودے چند لوگوں کا معاملہ ذہن سے نکال دیجئے جن کی فطرت بالکل ہی مسخ ہو چکی ہو' جن کے دل پتھر بن گئے ہوں' جن کا ضمیر مردہ ہو چکا ہو' جو اتنے کٹھور دل ہو چکے ہوں کہ انسانیت کی کوئی رمق بھی ان میں باقی نہ رہی ہو اور جن کی خود غرضی اور مفاد پرستی جملہ اخلاقی اقدار پر مسلط ہو چکی ہو۔ ان لوگوں کی حیثیت ان استثناءات کی ہے جو قواعد و کلیات کو مزید ثابت اور مؤکد کرتے ہیں۔ ورنہ قاعدہ کلیہ یہی ہے کہ فطرتِ انسانی نیکی اور بدی اور خیر و شر کے مابین واضح طور پر فرق اور تمیز کرتی ہے۔ فطرتِ انسانی کی اس بدیہی حقیقت پر اگر عقلِ سلیم کے اس مسلّمہ اصول کا اطلاق کیا جائے کہ ؏
"گندم از گندم بروید' جو ز جو!" تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کو نیک اعمال کا اچھا صلہ ملنا چاہئے اور بداعمالیوں کی سزا ملنی چاہئے' جبکہ فی الواقع جو صورت ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس دُنیا کی زندگی میں نیکی کا بدلہ بھلائی کی صورت میں اکثر و بیشتر تو بالکل ملتا ہی نہیں اور اگر ملے بھی تو نیکی کی مناسبت سے نہیں ملتا۔ اسی طرح بدی کی سزا اکثر و بیشتر ملتی ہی نہیں۔ اگر ملتی بھی ہے تو جرم کے تناسب کے ساتھ نہیں ملتی۔ مثلاً ہٹلر کا نام ذہن میں لائیے جس کی ہوسِ اقتدار اور جوع الارض کی وجہ سے لاکھوں انسان مارے گئے' لاکھوں خواتین بیوہ ہوئیں' کروڑوں بچے یتیم ہو گئے' ہزاروں افراد اپاہج ہو گئے' لاکھوں گھر تباہ و برباد ہو گئے' اور ان کے مکین بے خانماں ہو گئے۔ نوعِ انسانی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کتنا بڑا اور ہولناک جانی و مالی نقصان نوعِ بشر کو مجموعی طور پر ہٹلر کی ہوسِ ملک گیری اور نسلی برتری کے زعمِ باطل کے باعث پہنچا۔ اب اگر ہٹلر گرفتار ہو جاتا اور اس کے جسم کا ایک ایک ریزہ بھی کر دیا جاتا تو کیا اسے اپنے جرائم کی پوری سزا مل جاتی؟ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے ایک گولی سے خود اپنی زندگی ختم کر لی اور وہ اپنے جرائم کی دُنیوی سزا سے بالکل بچ گیا۔

معلوم ہوا کہ بعض اعتبارات سے یہ دُنیا ناقص ہے۔ یہاں قوانین طبعیہ تو پورے طور پر بروئے کار آ رہے ہیں۔ آپ اگر آگ میں انگلی ڈالتے ہیں تو وہ جل جاتی ہے' آپ کوئی

سمِ قاتل اور زہرِ ہلاہل کھائیں گے تو مرجائیں گے' لیکن لوگ جھوٹ بولتے ہیں تو کوئی گزند نہیں پہنچتا' زبان پر چھالا تک نہیں پڑتا' لوگ حرام خوریاں کرتے ہیں تو سب رچ پچ جاتا ہے' کسی نوع کے دردِ شکم تک سے سابقہ پیش نہیں آتا' لوگ حق تلفیاں کرتے ہیں' رشوتیں لیتے دیتے ہیں' جبر و استحصال اور ناجائز ذرائع سے دولت جمع کرتے ہیں تو اس طرح جو جتنا مالدار اور دولت مند ہوتا ہے' معاشرے میں اس کی اسی اعتبار سے عزت بڑھتی چلی جاتی ہے' حالانکہ اکثر لوگ جانتے ہیں کہ اس کی دولت مندی اور مالداری کی حقیقت کیا ہے اور کن ناجائز ذرائع سے اس نے دولت حاصل کی ہے۔ الغرض ایسے لوگ دُنیا میں گلچھرے اڑاتے ہیں' عیش کرتے ہیں' آسودہ حال رہتے ہیں' صاحبِ عزّت و شرف سمجھے جاتے ہیں' جن کے کوئی اصول نہیں ہیں' جو جائز و ناجائز' حرام و حلال اور خیر و شر کی تمیز اور اس بات کا رتّی بھر لحاظ رکھے بغیر کہ ان کے اس طرزِ عمل سے قومی و ملی مفادات اور ملکی معیشت کو کتنا مہلک نقصان پہنچ رہا ہے' ہر نوع کی جعل سازی سے دن رات دولت سمیٹنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسے لوگوں کے لئے زندگی کی ناگزیر ضروریات فراہم کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے جو جائز اور ناجائز میں امتیاز کریں' حلال اور حرام میں فرق کریں' صحیح اور غلط کا لحاظ رکھیں اور اخلاق کی اعلیٰ اقدار کا پاس کریں۔

اب یا تو یہ مانا جائے کہ یہ دُنیا نری اندھیر نگری اور چوپٹ راج ہے اور یہ تخلیق عبث اور بے مقصد ہے' ورنہ ایک دوسری زندگی کو ماننا لازم ٹھہرے گا' جس میں جزا و سزا کا قانون بھرپور طور پر بروئے کار آئے۔ یاد ہوگا کہ بالکل یہی بات سورۂ آلِ عمران کے آخری رکوع کے مطالعہ کے دوران ہمارے سامنے آچکی ہے کہ ﴿ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ ﴾ یعنی "اے ہمارے ربّ! تُو نے یہ سب کچھ بے مقصد' بے کار اور عبث پیدا نہیں کیا۔ تو اس سے پاک اور اعلیٰ و ارفع اور منزّہ و مبرّا ہے (کہ کوئی کام بے کار و بے مقصد کرے! تیری تخلیق کا یہ محکم نظام اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ نیکی کی جزا اور بدی کی سزا ملے گی۔) پس (اے ہمارے ربّ!) ہمیں آگ کے عذاب سے بچائیو!" لہٰذا عقل و منطق کی رو سے بدیہی طور پر لازم آتا ہے کہ اگر خیر خیر ہے' شر شر ہے' نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے تو ایک دوسری زندگی لازماً ہونی چاہئے جس

میں ان اعمال کے پورے نتائج ظاہر ہوں' نیکی کا بھرپور صلہ اور پورا پورا بدلہ ملے اور بدی کی بھرپور سزا ملے۔ الغرض یہ ہے قرآن حکیم کا بدیہیات فطرت پر مبنی استدلال جو وہ ؎ "اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں" کے مصداق مختلف اسالیب سے متعدد مقامات پر' کہیں تفصیل کے ساتھ اور کہیں اجمال کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ مثلاً سورۃ القلم میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿ اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ ۝ مَا لَکُمۡ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ ۝ ﴾ یعنی سوچو تو سہی' کیا ہم اپنے فرماں برداروں اور مجرموں کو برابر کر دیں گے؟ کیا تم لوگوں کی مت ماری گئی ہے کہ ایسا حکم لگاتے ہو؟ —— اگر واقعتاً کوئی اور زندگی نہیں ہے اور نہ کوئی آخرت ہے نہ محاسبہ' نہ جزا و سزا تو مجرم اور باغی تو مزے میں رہے کہ انہوں نے دُنیا میں اس پر عمل کیا کہ ؎ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"۔ گویا عقلی اور منطقی طور پر ان لوگوں کی روش زیادہ درست اور مناسب ہے جنہوں نے خیر و شر کے مابین کوئی امتیاز نہیں کیا۔ جنہوں نے جائز و ناجائز اور حلال و حرام کے درمیان کوئی تمیز نہیں کی۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر خود ہماری عقل تقاضا کرتی ہے کہ دوسری زندگی ہونی چاہئے جس میں انسان کو اپنے اعمال کی بھرپور جزا یا پوری پوری سزا مل جائے۔

بہرحال یہ ہے خلاصہ اس پورے استدلال کا جس کو یہاں پر صرف ایک قسم کے اسلوب سے پیش کیا گیا ہے : ﴿ وَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ ۝ ﴾ "اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی"۔ یہاں ذرا وہ بات بھی ذہن نشین کر لیجئے جو سورۃ العصر کے سبق کے ضمن میں عرض کی گئی تھی کہ قسم کا اصل مقصد گواہی اور شہادت ہے۔ گویا وقوعِ قیامت پر ایک تو خود یوم قیامت گواہ ہے' گویا "آفتاب آمد دلیل آفتاب" اور اگر وقوعِ قیامت پر کوئی اضافی گواہی مطلوب ہی ہے تو تمہارا اپنا ضمیر' تمہارا اپنا نفس ملامت گر گواہی دے رہا ہے کہ نیکی نیکی ہے' بدی بدی ہے' لہٰذا اس کا بھرپور بدلہ جزا یا سزا کی صورت میں ملنا چاہئے جو اس دُنیا میں نہیں ملتا۔ چنانچہ اس کے لئے ایک دوسرا عالم ہونا عین عقل کا تقاضا ہے۔

مناسب ہو گا کہ اس مقام پر اس شخص کا حوالہ بھی دے دیا جائے جسے جدید مغربی فلسفے کا باوا آدم قرار دیا جاتا ہے' یعنی کانٹ' جس نے اپنے فلسفہ میں اخلاقی قانون کو بڑی

اہمیت دی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی پہلی کتاب "تنقیدِ عقلِ خالص" (Critique of Pure Reason) میں تو یہ ثابت کیا تھا کہ وجود باری تعالیٰ کو کسی منطقی دلیل سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن پھر اپنی دوسری کتاب "تنقیدِ حکمتِ عملی" (Critique of Practical Reason) میں یہ بات ثابت کی کہ وجودِ باری تعالیٰ کے اثبات پر سب سے بڑی دلیل انسان کے اندر کا اخلاقی قانون ہے جو اس کے باطن اور اس کی فطرت میں ودیعت شدہ موجود ہے۔ یہ خیر و شر اور نیکی و بدی کی تمیز کہاں سے آئی؟ خالص مادّے میں یہ شعور کیسے پیدا ہو گیا؟ انسان کے سوا حیوانات میں یہ شعور موجود نہیں ہے۔ حیوانات صرف جبلت کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ انسان کی شان ہے کہ وہ اخلاقی شعور رکھتا ہے اور خیر کی قدر و قیمت کو جانتا ہے اور بدی اور شر سے طبعاً نفرت کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ خدا کی ہستی پر دو دلیلیں سب سے زیادہ قوی ہیں۔ ایک تو ہمارے اوپر یہ ستاروں بھرا آسمان خدا کی ایک عظیم نشانی ہے اور دوسری نشانی وہ اخلاقی قانون و شعور ہے جو فطرتِ انسانی میں مضمر اور ودیعت شدہ ہے۔ واضح رہے کہ کانٹ نے اخلاقی قانون کو اللہ تعالیٰ کے وجود کے اثبات کے لئے بطور دلیل استعمال کیا ہے، جبکہ قرآن مجید وقوعِ قیامت کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔

منکرینِ آخرت پر ردّ و قدح

سورۃ القیامہ کی ابتدائی دو آیات میں وارد شدہ قسموں کے بعد، جن کے بارے میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ان میں اثباتِ آخرت اور وقوعِ قیامت کے لئے قرآن مجید کا مثبت استدلال جامعیت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے، منکرینِ آخرت کے اعتراضات اور شبہات کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿ اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ لَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَہٗ ؕ﴾

"کیا انسان کا خیال یہ ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کر سکیں گے؟"

پھر فرمایا:

﴿ بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ﴾

"کیوں نہیں! ہم قادر ہیں اس پر کہ اس (انسان) کی ایک ایک پور کو برابر اور درست کردیں۔"

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے' اس اسلوب میں اصل وزن متکلم کی شخصیت کا ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ یہ بات کون کہہ رہا ہے! پھر یہ کہ وہ کس یقین سے کہہ رہا ہے اور کس اذعانی کیفیت کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ یقیناً ہم کو اس پر کامل قدرت حاصل ہے کہ ہڈیاں تو ہڈیاں ہم انسان کی انگلیوں کی ایک ایک پور اور اس کے ایک ایک ریشے کو درست کردیں اور از سر نو بنادیں۔ بظاہر تو یہ صرف ایک دلیل خطابی ہے' لیکن غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس میں ایک عقلی اور منطقی دلیل بھی مضمر ہے۔ اور وہ یہ کہ مخاطب اس بات پر غور کرے کہ آیا وہ اللہ کو بھی مانتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ اللہ ہی کو نہیں مانتا تو اس سے بعث بعد الموت اور قیامت و آخرت کے بارے میں گفتگو بے کار اور لاحاصل ہے۔ ایسے شخص سے تو پہلے وجود باری تعالیٰ کے بارے میں گفتگو ہوگی۔ لیکن اگر وہ اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کو مانتا ہے تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ کیا وہ اللہ کو ہر چیز پر قادر مانتا ہے؟ اگر اس نے اللہ کو "القدیر" اور "القادر" مانا ہے تو اب اس کا اعتراض از خود ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگر اللہ ہر چیز پر قادر ہے' تو پھر تمہارا اعتراض کس بات پر ہے؟ تمہارے تمام شکوک و شبہات کے غبارے کی ہوا تو اللہ کو قادر مطلق تسلیم کرنے کے بعد خود بخود نکل جاتی ہے' اس لئے کہ جو ہستی ہر چیز پر قادر ہے' وہی ہے جو مُردوں کو دوبارہ زندہ کرسکے گی۔

دوسری دلیل انسان کے مشاہدات سے دی گئی ہے۔ یہ دلیل اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیات (از ۳۶ تا ۴۰) میں وارد ہوئی ہے جہاں اس استفہام انکاری کے بعد کہ "کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟" انسان کو متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ ذرا اپنی تخلیق کے اس حصہ پر غور کرے جو اس کے علم میں ہے' یعنی رحمِ مادر میں جنین کے ارتقائی مراحل جن سے اللہ کی قدرت کاملہ اور اس کی تخلیقی قوتوں کا کسی درجے میں اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ ہر انسان جانتا ہے کہ اس کا آغاز ایک گندے پانی کی بوند سے ہوا۔ پھر اس نے ایک لوتھڑے کی شکل اختیار کی۔ پھر اسی لوتھڑے کے اندر سے یہ تمام اعضاء و جوارح' یہ سماعت و بصارت' یہ شعور و ادراک' یہ عقل و فہم' یہ غور و فکر کی استعداد اور حسی معلومات سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت'

الغرض انسان کی حیران کن مشینری وجود میں آئی' اور اس کی تخلیق بھی ہوئی اور تسویہ بھی ہوا' اور اس کی نوک پلک سنواری گئی۔ مزید برآں اسی گندے پانی کی بوند سے کسی کو مَرد بنا دیا کسی کو عورت' حالانکہ کوئی بڑی سے بڑی خوردبین بھی یہ فرق نہیں کر سکتی کہ رحم مادر میں نشو ونما پانے والا "نطفۂ امشاج" یعنی مرد کے نطفہ اور عورت کے بیضہ کے اتحاد و امتزاج سے وجود میں آنے والا واحد خلیہ نر ہے یا مادہ۔ پھر ذرا انسان غور کرے کہ مَرد اور عورت کا جسمانی نظام ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہے' اور اس پر بھی مستزاد ان کی نفسیاتی ساخت اور میلانات و رجحانات کے مابین کتنا فرق و تفاوت ہے! اور یہ سب کچھ اس گندے پانی کی بوند سے تخلیق کیا گیا ہے جس کا نام زبان پر لانا بھی کوئی شائستہ اور مہذب انسان پسند نہیں کرتا۔ اللہ کی یہ ساری خلاقی تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ اس سب کے باوجود بھی تمہیں یہ وسوسہ لاحق رہتا ہے اور تم یہ اعتراض کرتے ہو کہ انسان کے مرجانے اور مٹی میں مل کر مٹی ہو جانے' یا جل کر راکھ ہو جانے یا کسی درندے یا مچھلی کی غذا بن جانے کے بعد اسے دوبارہ کیسے اٹھایا جا سکتا ہے! اور کیسے دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے؟ کیا وہ اللہ جس کی خلّاقی کا یہ عالم ہے کہ وہ گندے پانی کی ایک بوند سے انسان جیسی اشرف المخلوقات ہستی تخلیق فرما دیتا ہے' اس پر قادر نہیں ہو گا کہ مُردوں کو دوبارہ زندہ کر سکے!! چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی ○ اَلَمْ یَکُ نُطْفَۃً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی ○ ثُمَّ کَانَ عَلَقَۃً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ○ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی ○ اَلَیْسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِیَ الْمَوْتٰی ○ ﴾

"کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس کو (بلا باز پرس) یونہی چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا (ابتداء میں) وہ منی کا ایک قطرہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا گیا تھا؟ پھر وہ خون کا ایک لوتھڑا بنا۔ پھر (اللہ نے اس کو انسان کی شکل میں) تخلیق فرمایا۔ پھر اس کا تسویہ فرمایا (اس کی نوک پلک سنواری)۔ پھر اس سے مَرد اور عورت کی دو جنسیں بنائیں۔ کیا وہ ہستی اس پر قادر نہیں ہے کہ مُردوں کو زندہ کر سکے؟"

الغرض یہ ہے وہ انسان کے مشاہدے پر مبنی منطقی دلیل جو منکرین قیامت کے وسوسے اور ان کے استبعاد کا قطعی ابطال کر دیتی ہے اور ان کے جملہ اعتراضات کی نفی کر

دیتی ہے۔

واضح رہے کہ اثباتِ آخرت اور وقوعِ قیامت کا مثبت استدلال تو وہ تھا جو اس سورۂ مبارکہ کے آغاز میں وارد شدہ دو قسموں میں سے دوسری قسم میں اجمال کے ساتھ بیان کر دیا گیا تھا کہ انسان کا ضمیر یا نفسِ لوّامہ شاہد ہے کہ فطرتِ انسانی نیکی اور بدی میں امتیاز کرتی ہے۔ اب ایک جانب عقلِ انسانی مطالبہ کرتی ہے کہ ؎ "گندم از گندم بروید' جو ز جو!" کے مطابق نیکی کی بھرپور جزا اور بدی کی پوری پوری سزا ملنی چاہئے' اور دوسری جانب مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ اس دُنیا میں فی الواقع ایسا نہیں ہو رہا' بلکہ بسا اوقات معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ دُنیا ناقص ہے' چنانچہ ایک دوسری زندگی ہونی چاہئے جس میں نیکی اور بدی کا بھرپور بدلہ ملے۔ عقل کے اس مطالبے اور فطرت کے اس تقاضے کے مقابلے میں منکرین آخرت و قیامت کی جانب سے صرف ایک منفی دلیل پیش کی گئی۔ یعنی صرف یہ استبعاد اور استعجاب کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جب انسان مٹی ہو کر مٹی میں مل جائے اور اس کی ہڈیاں بھی گل سڑ جائیں تو اسے دوبارہ اٹھالیا جائے۔

اس کا ایک جواب تو خطابی انداز میں دیا گیا کہ : ﴿ بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ۝ ﴾ یعنی "کیوں نہیں! ہم تو اس کی انگلیوں کی پوروں تک کو درست کرنے پر قادر ہیں"۔ جس میں یہ منطقی دلیل بھی مضمر ہے کہ جب تم اللہ کو مانتے ہو اور اسے ہر چیز پر قادر جانتے ہو تو اب تمہارے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی' اور دوسرا جواب انسان کی رحمِ مادر میں جنین کی حیثیت سے تخلیق کے حوالے سے دیا گیا۔ کس کے لئے ممکن ہے کہ اس ہستی کی قدرت اور تخلیقی قوت کا اندازہ کر سکے جو ایک گندے پانی کی بوند سے انسان جیسی عظیم مخلوق پیدا فرمادیتا ہے۔ کیا وہ قادرِ مطلق تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہ کر سکے گا؟ ظاہر بات ہے کہ اس سوال کا جواب ہر سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان اثبات میں دے گا۔ چنانچہ یہی بات ہمیں نبی اکرم ﷺ نے اس طرح تلقین فرمائی کہ آپؐ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپؐ اس سورۃ کے اختتام کے بعد فرمایا کرتے تھے : "بَلٰی وَرَبِّنَا" "کیوں نہیں! اے ہمارے رب' ہم اس پر گواہ ہیں کہ تو مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے"۔

انکارِ آخرت کے اسباب

اس سورۂ مبارکہ میں دوسرا اہم مضمون یہ سامنے آیا کہ اگر منکرین کا یہ اعتراض منطق اور عقل کی رو سے بالکلیہ باطل اور قطعاً بے وزن ہے تو پھر ان کے انکار کا اصل سبب کیا ہے اور یہ قیامت و آخرت کے منکر کیوں ہیں' اس کو تسلیم کیوں نہیں کرتے؟ اس کے تین نہایت اہم اور بنیادی سبب بیان کئے گئے۔

۱۔ فسق و فجور کی عادت : اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ جب انسان فسق و فجور کا عادی ہو جاتا ہے اور اسے حرام خوری کی عادت پڑ جاتی ہے اور وہ حرام کی کمائی سے حاصل ہونے والی عیش کا خوگر ہو جاتا ہے اور لذت کوشی اس کی گھٹی میں رچ بس جاتی ہے تو ان سب کا چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ اب اگر وہ آخرت کو مانے تو اسے حلال و حرام میں تمیز کرنی پڑے گی اور جائز و ناجائز کے فرق کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ چنانچہ جس طرح کبوتر جب بلی کو دیکھتا ہے تو اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے (حالانکہ اس طرح سے بلی معدوم نہیں ہو جاتی) اسی طرح وہ لوگ جو فسق و فجور کے عادی ہو چکے ہیں اور اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں' بلکہ اس کو جاری رکھنا چاہتے ہیں' وہ آخرت ہی کا انکار کر دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے اسی میں عافیت سمجھی ہے کہ روایتی کبوتر کی مانند قیامت و آخرت کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ گویا منکرین قیامت و آخرت کے انکار کا اصل سبب منطقی ہے نہ عقلی' بلکہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنی حرام خوری اور فسق و فجور کی روش اور لاابالیانہ طرزِ زندگی کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ نہایت جامع الفاظ میں ارشاد فرمایا : ﴿بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝﴾ یعنی ان کے اعراض و انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی فسق و فجور کی روش کو جاری رکھنا چاہتے ہیں!

۲۔ دُنیا کی محبت : آخرت اور قیامت کے انکار کا دوسرا سبب دُنیا کی حد سے بڑھی ہوئی محبت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا :

﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝﴾

"ہرگز نہیں! بلکہ تم لوگ عاجلہ سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو!"

یعنی تمہاری گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ تم عاجلہ کی محبت میں گرفتار ہو' اور اس کے پرستار بن گئے ہو۔ لفظ "عاجلہ" عجلت سے بنا ہے' اس سے مراد "دُنیا" ہے۔ اس لئے کہ اس کا نفع بھی فوری اور نقد ہے اور نقصان بھی فوری اور نقد ہے۔ اس کی لذتیں بھی بالفعل محسوس ہوتی ہیں اور اس کی کلفتیں بھی فوری اثر کرنے والی ہوتی ہیں۔ تم اس عاجلہ سے دل لگائے ہوئے ہو اور آخرت کی زندگی کو نظرانداز اور فراموش کئے ہوئے ہو۔ یہاں عاجلہ کا لفظ استعمال کر کے اس حقیقت کی جانب توجہ مبذول کرادی گئی کہ اس دُنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ فوری لذتوں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور فوری آسائشوں کو قربان نہیں کرسکتے' وہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس کے برعکس جنہیں آگے بڑھنا ہوتا ہے اور جو دُور اندیش اور دُوربین ہوتے ہیں وہ فوری راحت و آرام کو تج دیتے ہیں اور سخت محنت کرتے ہیں یہاں تک کہ راتوں کو جاگتے ہیں تاکہ اپنے دُنیوی کیریئر کو روشن بنا سکیں۔ بالکل اسی طرح جو لوگ دُنیا کی فوری لذت اور عیش و راحت کو قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے' جو اس عاجلہ (دُنیا) کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور اس عروسِ ہزار داماد کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں' جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ آخرت سے غافل رہتے ہیں اور اللہ کی جناب میں محاسبہ کے لئے کھڑے ہونے کو فراموش کردیتے ہیں' وہ اُخروی زندگی میں لامحالہ ناکام اور خائب و خاسر ہو کر رہیں گے۔ لیکن افسوس کہ انسان مختصر سی حیاتِ دُنیوی میں تو مستقبل سے غافل نہیں ہوتا' لیکن آخرت کی ابدی زندگی سے غافل رہتا ہے اور حیاتِ دُنیوی کو اس انداز سے بسر کر دیتا ہے کہ ؎

اب تو آرام سے گزرتی ہے
آخرت کی خبر خدا جانے!

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دو حکیمانہ اشعار میں دُنیا میں کامیابی اور ناکامی کا نقشہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچ دیا ہے کہ ؎

يَغُوصُ الْبَحرَ مَنْ طَلَبَ اللَّؤَالِي
وَمَنْ طَلَبَ الْعُلٰى سَهِرَ اللَّيَالِي

وَمَن طلَب العلي مِن غَيرِ كَدٍّ
اضاع العمرَ فی طلَب المحالی

"جو موتیوں کا طالب ہوتا ہے لامحالہ سمندر میں غوطے لگاتا ہے۔ اور جو بلند مقام حاصل کرنا چاہتا ہے وہ راتوں کو جاگتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص بغیر محنت و مشقت کے بلند مقام و مرتبہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اپنی عمر ناممکن چیز کی خواہش میں ضائع کر دیتا ہے۔"

گویا بقول حالی مرحوم ؎

تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی!

افسوس کہ دُنیا میں ایسے انسان تو پھر بھی بہت سے مل جاتے ہیں جو دُنیا کے حصول کے لئے محنت و مشقت بھی کرتے ہیں اور راحت و آرام کو بھی تج دیتے ہیں' لیکن آخرت کی کامیابی کے حصول کے لئے اس طرزِ عمل کے اختیار کرنے والے بہت ہی کم ہیں!

۳۔ تکبّر و تمرّد : اس سورۂ مبارکہ میں انکارِ قیامت و آخرت کا جو تیسرا اہم سبب بیان کیا گیا ہے' وہ تکبر ہے۔ ارشاد فرمایا گیا :

﴿ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ۝ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی ۝ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰی اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰی ۝ ﴾

"پس اس نے نہ تصدیق کی اور نہ نماز ادا کی۔ بلکہ جھٹلایا اور روگردانی کی۔ پھر اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیا۔"

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ تابعین کرامؒ میں سے جن حضرات کو تفسیر قرآن سے خصوصی شغف تھا' وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ الفاظ عام ہیں اور ان میں ایک عام متکبر انسان کی نقشہ کشی کی گئی ہے' لیکن یہاں معین طور پر ابو جہل مراد ہے۔ یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ ابو جہل کے اعراض و انکار اور کفر و تکذیب کا سب سے بڑا سبب تکبر تھا۔ وہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے نیچا ہونے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اسی لئے اس نے تصدیق نہیں کی۔ "فَلَا صَدَّقَ" میں اس کی اسی روش کا ذکر ہے۔ اس لئے کہ اگر وہ حضور ﷺ کی تصدیق کرتا جو خبر دے رہے تھے وقوعِ قیامت کی اور جو مدّعی تھے اللہ کے نبی اور رسول ہونے

کے' تو آپؐ کی تصدیق کے لازمی معنی یہ ہوتے کہ وہ آپؐ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا اور آپؐ کی اطاعت کلی قبول کرتا ہے' اور اس کے لئے اس کی متکبّرانہ طبیعت آمادہ نہیں تھی۔ اسی طرح جو شخص نماز پڑھتا ہے وہ ہمہ تن اللہ کے سامنے جھکتا ہے' جس کا نقطہ آغاز ہے ادب کے ساتھ جھک کر کھڑے ہونا' اور پھر درمیانی مقام ہے حالت رکوع' اور اس کی انتہا ہے حالت سجدہ۔ اب بہت سے انسان اتنے سرکش اور متمرد ہوتے ہیں کہ ان کی اکڑی ہوئی گردنیں اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی جھکنے کیلئے تیار نہیں ہوتیں۔ الغرض تصدیق اور نماز کی راہ میں رکاوٹ اور انکار و تکذیب پر آمادہ کرنے والی اہم چیز ہے تکبر و تمرد' جس کا نقشہ کھینچ دیا گیا ان الفاظ مبارکہ سے کہ ﴿ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ۝ ﴾ "پھر وہ چل دیا اپنے گھر والوں کی جانب اکڑتا اور اینٹھتا ہوا!"

تین ہولناک مناظر کی نقشہ کشی

اب اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کے تیسرے اہم حصے کی جانب توجہ منعطف کیجئے جو تین مواقع کی منظر کشی پر مشتمل ہے' جن کی ایسی کامل تصویر لفظی پیش کر دی گئی ہے کہ نگاہوں کے سامنے پورا نقشہ آجاتا ہے۔ چنانچہ ایک نقشہ ہے "اَلسَّاعَةُ" کا' یعنی وہ بڑی ہلچل جو اِس کائنات کے نظام میں آنے والی ہے' جس کے بارے میں سورۃ الحج میں ارشاد فرمایا گیا : ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝ ﴾ یعنی "لوگو! اپنے پروردگار اور اپنے آقا کا تقویٰ اختیار کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو' اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ "السَّاعَةُ" کا زلزلہ بڑی خوفناک چیز اور بہت ہولناک واقعہ ہو گا!" یہ قیامت کی آمد کا پہلا نقشہ ہے جسے قرآن مجید یہاں "السَّاعَةُ" سے موسوم کرتا ہے۔ اسی کو دوسرے مقامات پر اَلْقَارِعَةُ' اَلْحَاقَّةُ' اَلطَّاغِيَةُ' اَلصَّاخَّةُ اور الطَّامَّةُ الْكُبْرٰى بھی فرمایا گیا۔ اس "السَّاعَةُ" کا نقشہ اس سورۂ مبارکہ میں یوں کھینچا گیا :

﴿ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝ ﴾

"جب نگاہ چندھیا جائے گی۔ چاند بے نور ہو جائے گا اور سورج اور چاند ایک کر دیئے جائیں گے"۔

معلوم ہوتا ہے کہ کشش ثقل کا جو باہمی نظام ہے' اس کا معاملہ درہم برہم ہو جائے گا اور یہ بڑے بڑے کُرّے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائیں گے اور چاند سورج میں دھنس جائے گا۔ تو یہ اس السَّاعَةُ کے ابتدائی احوال ہیں۔ جب یہ کیفیت نظر آئے گی تو یہی انسان جو اس وقت اکڑ رہا ہے' بڑے متکبرانہ انداز میں چیلنج کر رہا ہے کہ:
﴿ يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ﴾ "(تحدّی کے ساتھ) پوچھتا ہے کہ کب ہو گا قیامت کا دن؟" اس روز اس کا یہ حال ہو گا کہ: ﴿ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ﴾ "یہ انسان کہہ رہا ہو گا کہ ہے کوئی جائے فرار؟ (ہے کوئی پناہ گاہ؟)" جواباً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہو رہا ہے:

﴿ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمُسْتَقَرُّ ۝ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝ ﴾

"ہرگز نہیں! اس روز کوئی جائے پناہ نہیں ہو گی۔ اس روز تو تیرے رب ہی کے سامنے جا کر ٹھہرنا ہو گا۔ اس روز انسان کو جتلا دیا جائے گا جو کچھ اس نے آگے کیا (یا آگے بھیجا) اور جو کچھ پیچھے کیا (یا پیچھے چھوڑا)!"

یہ ایک نقشہ تو "السَّاعَة" کا ہے جو کھینچا گیا۔ دوسرا نقشہ ہے "يَوْمُ الْقِيَامَةِ" کا ــــــ جس روز لوگ اپنے رب کے حضور میں کھڑے ہوں گے' نتیجہ کا اعلان ہونے والا ہو گا۔ جیسے کہ آپ نے اسکولوں میں دیکھا ہو گا کہ جس روز سالانہ امتحان کا نتیجہ نکلتا ہے تو طالب علم جب کھڑے ہوتے ہیں تو نتیجہ گویا ان کے چہروں پر پہلے ہی سے لکھا ہوا ہوتا ہے۔ جو کامیاب ہونے والے ہوتے ہیں' جن کو معلوم ہے کہ ہم امتحان کے پرچے اچھے کر کے آئے ہیں' ان کے چہرے تر و تازہ ہوتے ہیں' انہیں کوئی تشویش نہیں ہوتی۔ اور جنہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم فیل ہونے والے ہیں' وہ نتیجہ کے متعلق خود جانتے ہیں کہ وہ کیا ہو گا! اسی کو اس سورۂ مبارکہ کی آیات ۱۴' ۱۵ میں یوں فرمایا گیا:

﴿ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝ ﴾

"ہر انسان کو خوب معلوم ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے اور وہ کہاں کھڑا ہے! خواہ وہ کتنے ہی بہانے تراشے' اور معذرتیں پیش کرے (اور اپنی چرب زبانی سے اعتراض کرنے والوں کی زبانیں بند کر دے)۔"

لیکن وہ اپنی تمام باطنی کیفیات اور اپنے اصل محرکات عمل کو اچھی طرح جانتا ہے۔ لہٰذا جب وہ بارگاہِ ربّ العزت میں کھڑے ہوں گے تو ان کے چہروں پر ان کا انجام' ان کے امتحان کا نتیجہ لکھا ہوا ہو گا۔ اسی بات کو اگلی آیات (۲۲ تا ۲۵) میں فرمایا گیا :

﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ ﴾

"اس روز بہت سے چہرے ہوں گے تروتازہ اور شاداں و فرحاں' اپنے پروردگار کی رحمت کے امیدوار (یا اپنے پروردگار کی جانب دیکھتے ہوئے)"۔

اس کے برعکس کچھ لوگوں کا حال یہ ہو گا کہ :

﴿ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ۝ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۝ ﴾

"اور کچھ چہرے ہوں گے اس دن سوکھے ہوئے اور اداس (افسردہ و پریشان) اس خیال سے لرز رہے ہوں گے کہ اب ہمارے ساتھ کمر توڑ دینے والا سلوک ہونے والا ہے"۔

تیسرا نقشہ جو کھینچا گیا' وہ ہے قیامت صغریٰ یعنی عالمِ نزع کا نقشہ' جب اس دُنیا سے روانگی کا وقت ہوتا ہے اور انسان کو یقین آ جاتا ہے کہ اب اپنے اہل و عیال اور مال و منال سے جدائی کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے : ((مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ)) "جو مر گیا اس کی قیامت تو واقع ہو گئی"۔ یعنی دُنیا کی مہلت عمل ختم ہو گئی' جیسا کہ امتحان گاہ میں کہا جاتا ہے کہ وقت ختم ہو گیا' لکھنا بند کر دیا جائے اور قلم رکھ دیئے جائیں۔ تو یہ موت در حقیقت مہلت عمل کے خاتمے کا نام ہے اور وقوعِ جزاو سزا کا مقدمہ اور پیش خیمہ ہے۔ اس وقت کا نقشہ کھینچا گیا :

﴿ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۝ وَقِيْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ۝ ﴾

"ہرگز نہیں! جس روز کہ جان ہنسلیوں میں آن پھنسے گی اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا؟" ـــــــ یعنی اب تو ساری تدبیریں ناکام ہو چکیں اور معالج جواب دے چکے۔ آپ نے دیکھا ہو گا اس موقع پر بسا اوقات بڑے سے بڑا عقلیت پرست بھی اس تگ و دو میں لگ جاتا ہے کہ کوئی ٹونا ٹوٹکا ہی کام کر جائے اور کسی تیر تکے ہی سے کام چل جائے :

﴿ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝ ﴾

"اور یقین ہو جائے گا کہ اب جدائی کا وقت آن پہنچا ہے' اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹی ہو گی"۔
ـــــ آخری آیت میں جو حالت بیان فرمائی گئی ہے وہ دُنیا سے آخرت کی جانب انتقال (نقل مکانی) کے مختلف مراحل کی نہایت جامع اور فصیح و بلیغ تعبیر ہے' یعنی :

﴿ اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَئِذِ ﹰالْمَسَاقُ ۝ ﴾

"(اس روز کہا جائے گا) آج تو اپنے رب کی طرف ہی جانا ہے (چارو ناچار' کشاں کشاں)۔"

الغرض یہ تین نقشے ہیں' جن کو پیش کرنے سے مطلوب و مقصود یہ ہے کہ جو لوگ آخرت اور قیامت کے منکر ہیں' جو کبوتر کی مانند اپنی آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں' جو اپنی فطرت کی گواہی پر غور نہیں کر رہے' اپنے ضمیر کی پکار کو نہیں سن رہے' اس کی خلش پر دھیان نہیں دے رہے' نفسِ ملامت گر کی پروا نہیں کر رہے' جو عقل و خرد اور فہم و ادراک نیز شعور سے کام نہیں لے رہے' ان کے باطن کی بصیرت شاید ان واقعات و حالات کی تذکیر سے جاگ جائے' جن کا وقوع پذیر ہونا یقینی' قطعی اور حتمی ہے' جیسا کہ سورۃ الذّاریات میں فرمایا گیا :

﴿ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ۝ ﴾

"بلاشبہ تم سے جو وعدہ کیا جا رہا ہے وہ سچا ہے' حق ہے' اور یقیناً جزا و سزا واقع ہو کر رہے گی۔"

گویا جو لوگ ان حقائق کو اپنے شعور و ادراک سے دُور رکھے ہوئے ہیں اور ان کی طرف سے اپنی نگاہیں بند کئے ہوئے ہیں' اور جو خواب غفلت میں مدہوش ہیں' ان نیند کے متوالوں کو اس سورۂ مبارکہ میں مؤثر ترین اسالیب سے جگایا جا رہا ہے اور جو اس کے باوجود نہ جاگیں' بلکہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کئے رہیں ان کے لئے سورۂ مبارکہ کی آیات ۳۴'۳۵ میں فرمایا :

﴿ اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی ۝ ثُمَّ اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی ۝ ﴾

"(اے غفلت شعار!) تیرے لئے افسوس اور ہلاکت ہے' اور پھر افسوس اور بربادی ہے!"

اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجام بد سے بچائے اور ہمارے دلوں میں آخرت کا

یقین بھی پیدا فرمادے اور "زَلْزَلَةَ السَّاعَة" اور "اھوال القِیامة" کی سختیاں آسان فرماکر جنت الفردوس میں داخل فرمائے' آمین!

عُجلت خیر میں بھی پسندیدہ نہیں

وقوعِ قیامت اور اثباتِ آخرت کے ضمن میں منکرین کے اعتراضات' اشکالات اور شبہات کے جواب کا مطالعہ مکمل کرنے کے بعد اب ہمیں ان چار آیات (۱۶ تا ۱۹) کا مطالعہ کرنا ہے' جن میں خطاب براہ راست نبی اکرم ﷺ سے ہے اور جن میں اولاً آپؐ کو تحصیلِ قرآن کے ضمن میں فرطِ شوق و اشتیاق کی بناء پر عُجلت پسندی سے نہایت شفقت و محبّت کے ساتھ روکا گیا ہے' اور اس کے ساتھ ہی آپؐ کو یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ متنِ قرآن کے ضمن میں جمع و ترتیب اور مطالب قرآن کے ضمن میں تفتیش و تدقیق کے لئے آپؐ کو زحمت اور مشقت کی ضرورت نہیں ہے' ان جملہ امور کی کامل ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہے۔ تو آیئے کہ پہلے ان آیات مبارکہ کا ایک سلیس و رواں ترجمہ سامنے رکھ لیں اور پھر ان میں سے مقدم الذکر مضمون پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ غور کریں۔

﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ○ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ○ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ○ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ○ ﴾

"(اے نبیؐ!) آپ اِس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو (تیزی سے) حرکت مت دیا کیجئے کہ اسے جلدی سے حاصل کریں۔ ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا اور اِس کا پڑھوانا۔ تو پھر جب ہم اِسے پڑھ چکیں تو اس پڑھنے کی آپ (بھی) پیروی کیجئے' پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اِس کی وضاحت بھی!"

یہ بات اس سے پہلے عرض کی جاچکی ہے کہ قرآن مجید کا اسلوب چونکہ خطبہ کا ہے اور خطبہ میں تحویل خطاب ہوتا رہتا ہے کہ ابھی خطیب کسی ایک جانب مخاطب تھا' پھر اس کا خطاب دوسری جانب ہوگیا۔ مزید برآں کبھی وہ حاضر کو غائب فرض کرکے گفتگو کرتا ہے اور کبھی غائب کو حاضر فرض کرکے گفتگو شروع کردیتا ہے۔ سورۃ القیامہ میں اس کی ایک نمایاں مثال زیرِ مطالعہ آیات کی صورت میں موجود ہے۔ اس لئے کہ یہ سورۂ مبارکہ از اوّل تا آخر مختلف اسالیب سے منکرین قیامت کے ساتھ بحث و گفتگو اور ردّو قدح پر

مشتمل ہے' لیکن درمیان میں خطاب کا رُخ نبی اکرم ﷺ کی جانب مڑ گیا۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے اصل مضمون کے ساتھ اس گفتگو کا ربط و تعلق کیا ہے! اس لئے کہ چاہے کسی سلسلہ کلام میں کوئی بات ضمنی طور پر آئی ہو لیکن ظاہر ہے کہ کلام کے عمود کے ساتھ اس کا کوئی نہ کوئی ربط ضرور ہوتا ہے' خواہ وہ کتنا ہی "خفی" ہو۔ چنانچہ اس سورۂ مبارکہ میں لوگوں کی گمراہی کا ایک اہم اور بنیادی سبب "حُبِّ عاجلہ" کو قرار دیا گیا ہے :

﴿ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝ ﴾

"ہرگز نہیں' بلکہ (تمہاری گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ) تم عاجلہ کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہو اور آخرت کو نظرانداز کر دیتے ہو۔"

یعنی اِنسان کی گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ "عاجلہ" یعنی دُنیا سے دل لگا بیٹھتا ہے' اس لئے کہ اس کی لذتیں بھی فی الفور محسوس ہوتی ہیں اور انسان ان سے شاد کام ہوتا ہے اور اس کی کلفتیں اور اذیتیں بھی انسان کو فوری طور پر متاثر کرتی ہیں۔ گویا دُنیا کا نفع بھی نقد ہے اور نقصان بھی۔ چنانچہ جب یہ "عاجلہ" انسان کا اصل مطلوب و مقصود بن جاتی ہے تو اس کائنات اور اسکی تخلیق کے وسیع ترین حقائق اور بلند ترین مقاصد انسان کی نگاہوں سے خود بخود اوجھل ہو جاتے ہیں' اور انسان کا شعور ان سے محجوب ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ آخرت کو مختلف غلط تاویلات سے نظرانداز کر دیتا ہے' بلکہ اس پر اعتراضات' اشکالات اور شبہات وارد کرتا ہے' حتیٰ کہ اسے محال مطلق گردانتا ہے اور اس کا انکار کر دیتا ہے۔

یہاں ایک نہایت لطیف لفظی مناسبت سے بات کا رُخ حضور اکرم ﷺ کی طرف موڑ دیا جاتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے : ﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ ﴾ "(اے نبیؐ!) آپ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں کہ قرآن کو جلدی سے یاد کر لیں یا حاصل کر لیں"۔ یہاں عجلت کے ذکر سے اِس عظیم حقیقت کی جانب اِشارہ فرما دیا گیا ہے کہ "عجلت پسندی" وہ چیز ہے جو خیر کے لئے بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ بلکہ "سہج پکے سو میٹھا ہو" کے مصداق خیر اور نیکی کے کاموں میں بھی مناسب تدریج اور میانہ روی پیش نظر رہنی چاہئے' تب ہی ان میں تمکن و استحکام بھی پیدا ہوتا ہے اور نتائج بھی صحیح اور متوازن طور پر برآمد ہوتے ہیں۔ الغرض' یہ تو ایک بڑی لطیف معنوی ربط کی بات تھی جس کے حوالے

سے نبی اکرم ﷺ کی طرف خطاب کا رخ مڑ گیا۔

البتہ یہاں عجلت پسندی کے متعلق یہ بات بھی نوٹ کر لی جائے تو مناسب ہو گا کہ قرآن حکیم اس کو انسان کی طبعی کمزوریوں میں شمار کرتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہوتا ہے : ﴿ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ﴾ (آیت ۳۷) یعنی "انسان کی خلقت اور سرشت میں جلد بازی کا عنصر شامل ہے"۔ یہ بالکل وہی اسلوب ہے جو سورۃ النساء میں وارد ہوا کہ : ﴿ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيفًا ۝ ﴾ (آیت ۲۸) "انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے"۔ پس معلوم ہوا کہ انسان کی خلقت اور سرشت میں بعض پہلو ضعف کے ہیں، جن میں سے ایک عجلت پسندی بھی ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا : ﴿ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ۝ ﴾ (آیت ۱۱) "انسان بہت جلد باز واقع ہوا ہے"۔ اب ظاہر ہے کہ اگر اس عجلت پسندی کا رُخ شر اور نفس پرستی کی طرف ہو جائے تب تو اس کی تباہ کاری اور ہولناکی اظہر من الشمس ہے ہی، لیکن اگر عجلت پسندی کا رُخ خیر کی جانب ہو تب بھی یہ ایک غیر مطلوب اور ناپسندیدہ شے ہے۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال سورۂ طٰہٰ میں آئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب کوہ طور پر اللہ تعالیٰ نے طلب فرمایا تو آں جناب علیہ السلام وقت مقررہ سے پہلے پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے سوال کیا : ﴿ وَمَا اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝ ﴾ (آیت ۸۳) "اے موسیٰ! تم وقت مقررہ سے قبل اپنی قوم کو چھوڑ کر کیوں آ گئے؟" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواباً عرض کیا ﴿ هُمْ اُولَاۗءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝ ﴾ (آیت ۸۴) "پروردگار! وہ بھی میرے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں اور میرے رب! میں تو تیری طرف جلدی کر کے اس لئے آیا ہوں کہ تو راضی ہو جائے" (آیات ۸۳، ۸۴)۔ گویا وہ جو ایک مشہور مصرع ہے ؏ "تُو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار دیکھ!" اس میں تھوڑا سا تصرف کر لیجئے کہ ؏ "تُو میرا شوق دیکھ، مرا اشتیاق دیکھ!" یعنی میں تو اے رب! تیری ملاقات کے شوق میں جلدی کر کے پہلے آ گیا ہوں۔ لیکن اب اللہ تعالیٰ کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوا : ﴿ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ۝ ﴾ (آیت ۸۵) "(اللہ نے) فرمایا : (اے موسیٰ، تمہاری عجلت کا نتیجہ یہ نکل چکا ہے کہ) ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو فتنہ میں مبتلا کر دیا ہے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے"۔ معلوم ہوا کہ اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عجلت اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور مخاطبہ الٰہی سے شاد کام ہونے کے اشتیاق پر مبنی تھی، جو سراسر خیر اور ہر اعتبار

سے قابل تعریف جذبہ ہے' لیکن عالم واقعہ میں اس کا بھی ناپسندیدہ نتیجہ ظاہر ہوا۔

اسی سورۂ طٰہٰ میں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کر کے فرمایا گیا: ﴿ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ○﴾ (آیت ۱۱۴) یعنی اے نبی ﷺ! آپ کا ذوق و شوق ہمارے علم میں ہے۔ آپ کا یہ اشتیاق اپنی جگہ! لیکن ہم نے نزول قرآن کے لئے ایک ترتیب اور ایک تدریج مقرر کر رکھی ہے۔ ہماری حکمتِ بالغہ میں اس کا جو بھی وقت معیّن ہے' اس کا نزول اسی کے مطابق ہو گا۔ رہی علم کی وہ پیاس جو آپ کو اپنے قلبِ مبارک میں شدّت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے تو اس کے لئے آپ دعا کرتے رہا کیجئے کہ "اے میرے ربّ! میرے علم میں اضافہ فرما"۔

سورۂ مریم میں یہی مضمون اس انداز میں وارد ہوا ہے کہ آنحضور ﷺ کے شوق و اشتیاق اور وحی کے انتظار کے متعلق حضرت جبرئیل علیہ السلام سے کہلوایا گیا: ﴿ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ○﴾ (آیت ۶۴) "ہم آپ کے ربّ کے حکم کے بغیر نازل نہیں ہو سکتے۔ جو کچھ ہمارے سامنے ہے اس کا اختیار بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اس کا اختیار بھی اسی کے ہاتھ میں ہے' اور جو کچھ ان دونوں کے مابین ہے اس کا اختیار بھی کلیتاً اسی کے پاس ہے۔ اور آپ کا ربّ بھولنے والا نہیں ہے!" — ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے شکوہ کیا ہو گا کہ آپ دیر دیر سے اور وقفہ دے کر آتے ہیں' جبکہ ہمیں وحی کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ اِس شکوہ کا جواب ہے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے دلوایا کہ ہم اللہ کے حکم سے وحی لے کر آتے ہیں۔ اُس کا علم کامل ہے' کائنات کی کوئی چیز اُس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ تاخیر و تعویق اس کے کسی نسیان کے باعث نہیں ہے بلکہ اس کی حکمت بالغہ کے مطابق ہے۔

پھر اسی سورۂ مریم میں حضور اکرم ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا: ﴿ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ○﴾ (آیت ۸۴) "پس (اے نبیؐ!) آپ ان (کافروں) پر عذاب کے نزول کے لئے جلدی نہ کیجئے۔ بالتحقیق ہم ان کے لئے (دن) گن رہے ہیں"۔ یعنی یہ کفار و مشرکین ہماری گرفت میں ہیں' کہیں بھاگ کر نہیں جا سکیں گے۔ ان میں سے ہر ایک کو کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے گا۔ لیکن اس کے لئے بھی ایک مہلت ہمارے علم کامل اور حکمت بالغہ میں

معین ہے ــــ اور جیسے سورۃ الطارق میں ارشاد فرمایا گیا : ﴿ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِیْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَیْدًا ۝ ﴾ "پس (اے نبیؐ!) ان کافروں کو ذرا کی ذرا ان کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ ان کے لئے جو ڈھیل اور مہلت ہم نے مقرر کر رکھی ہے ذرا اسے ختم ہو لینے دیجئے!" یعنی ہمارے علم کامل میں ہر چیز کا وقت معین ہے۔ اجل مسمی کو کوئی ٹال نہیں سکے گا۔ اور جب وہ وقت معین آ جائے گا تو ان کا حساب پاک کر دیا جائے گا۔

الغرض یہاں پہلی بات یہ ارشاد فرمائی گئی کہ اے نبی! آپ قرآن کو یاد کرنے کے لئے جلدی نہ کیا کیجئے اور اس کے لئے اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیا کیجئے ــــ اور اس مضمون کو عجلت کی لفظی مناسبت کی بناء پر سورۃ القیامہ میں نگینے کے مانند جڑ دیا گیا کہ عجلت پسندی تو وہ شے ہے جو نیکی اور خیر کے کاموں کے ساتھ بھی مناسبت نہیں رکھتی، کجا یہ کہ انسان پر "حبِّ عاجلہ" کا ایسا غلبہ ہو جائے کہ اس کی ساری جدوجہد، سعی و محنت اور تگ و دو کا مقصود و مطلوب ہی صرف "عاجلہ" یعنی دُنیا کی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت کا حصول بن کر رہ جائے۔ تو اس کے جو خراب نتائج نکلیں گے ان کا تم خود بخوبی اندازہ کر سکتے ہو۔ اس پورے مفہوم کو دریا کو کوزے میں بند کرنے کے انداز میں نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ ان دو آیات میں سمو دیا گیا۔ یعنی تمہاری تمام تر گمراہی اور ضلالت، اور کفر و تکذیب، اور اعراض و انکار کا اصل سبب یہ ہے کہ تم عاجلہ (اس دُنیا) کی محبت میں گرفتار ہو اور آخرت کو نظرانداز کر دیتے ہو۔

یہاں ضمناً ایک وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ قرآن مجید میں "سَارِعُوْا" اور "سَابِقُوْا" کے الفاظ بھی متعدد مقامات پر وارد ہوئے ہیں، جیسے سورۂ آل عمران میں فرمایا : ﴿ وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ (آیت ۱۳۳) اور دوڑ لگاؤ اپنے ربّ کی مغفرت کی طرف!" اسی طرح سورۃ الحدید کی آیت ۲۱ میں فرمایا گیا : ﴿ سَابِقُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ "ایک دوسرے سے آگے نکلو اپنے ربّ کی مغفرت کی طرف!" "سَارِعُوْا" اور "سَابِقُوْا" فعل امر کے صیغے ہیں۔ سورۃ المؤمنون کی آیت ۶۱ میں مؤمنین صادقین کے اوصاف کے ضمن میں یہ دونوں الفاظ خبریہ انداز میں فعل مضارع اور اسم فاعل کی صورت میں وارد ہوئے ہیں : ﴿ اُولٰٓئِكَ يُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝ ﴾ "یہی لوگ ہیں جو بھلائیوں کے لئے تیز گام ہیں اور اس راہ میں سب سے آگے نکل جانے والے ہیں"۔ سَرِعَ، یَسْرَعُ

سے باب مفاعلہ کا مصدر ہے "مُسَارَعَةٌ" اور سَبَقَ یَسْبِقُ سے باب مفاعلہ ہی کا مصدر ہے "مُسَابَقَةٌ"۔۔۔۔ اور یہ دونوں قریب المفہوم اور تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ ان دونوں کا مفہوم ہے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں دوڑ لگانا۔ البتہ مسارعت و مسابقت اپنے اساسی مفہوم کے اعتبار سے عجلت پسندی سے قدرے مختلف شے ہے۔ واضح رہے کہ مسارعت اور مسابقت کا جذبہ بھی طبع انسانی میں ودیعت شدہ موجود ہے۔ چنانچہ ہر انسان دوسرے لوگوں سے آگے نکلنا اور بڑھنا چاہتا ہے۔ قرآن مجید مسارعت و مسابقت کے اس جذبہ کے رُخ کو خیر کی طرف موڑ دینا چاہتا ہے۔ وہ انسان کو تعلیم دیتا اور تلقین کرتا ہے کہ "دُنیا" یعنی دُنیوی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت کے حصول میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی سعی و کوشش کرنے کے بجائے تم بھلائیوں میں' نیکیوں میں' خیر میں' خدمت خلق میں' عبادات کی بجا آوری میں' دین کے احکام اور اس کے اوامر و نواہی کی تعمیل میں' دین کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت کی سعی و جہد میں اور اقامت دین اور غلبہ دین کے لئے انفاق مال اور بذلِ نفس میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ یہ اللہ کی مغفرت اور جنت کے شاہ درے ہیں۔

البتہ ہر کام کے لئے مناسب تدریج بھی ضروری ہے اور اس کی جملہ شرائط کو پورا کرنے میں جو مناسب وقت لگنا چاہئے اس کے ضمن میں صبر کا مظاہرہ بھی ضروری ہے۔ جیسے اگر نماز کو بہت جلدی جلدی پڑھا جا رہا ہو تو حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق ایسی نماز ادا نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک بدوی مسلمان نے مسجد نبویؐ میں آکر جلدی جلدی نماز پڑھ لی تو حضور ﷺ نے اس سے فرمایا : ((صَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ)) "دوبارہ نماز پڑھ' اس لئے کہ تیری نماز ادا نہیں ہوئی"۔ لہٰذا نماز کے ہر رکن کا حق پورے سکون اور ٹھہراؤ کے ساتھ ادا کرنا ضروری اور لازمی ہے۔ اسی طرح اگرچہ قرآن حکیم میں نماز جمعہ کے بارے میں فرمایا گیا :
﴿ إِذَا نُودِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ "جب نمازِ جمعہ کے لئے اذان ہو جائے تو اللہ کی یاد کے لئے دوڑو۔" لیکن تمام مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہاں سعی (فَاسْعَوْا) سے دوڑنا مراد نہیں ہے۔ اس لئے کہ نماز کے لئے دوڑ کر آنے سے حضور اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے' یہ وقار اور سکینت کے منافی ہے۔ لہٰذا یہاں سعی سے مراد لپکنا ہو گا۔ یعنی اپنے تمام کاموں سے ذہنی و عملی تعلق توڑ کر جمعہ کی نماز

کے لئے لپکو اور ہمہ تن اسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

اللہ کی جانب سے متنِ قرآن کی حفاظت
اور معانی قرآن کی وضاحت کی ضمانت

آیت ۱۶ میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے جو بات فرمائی گئی' یعنی آنحضور ﷺ کو اپنی زبان مبارک کو قرآن حکیم کے ساتھ تیزی کے ساتھ حرکت دینے سے کمال شفقت و محبت کے ساتھ روکا گیا' تو آپؐ کے اس طرز عمل کا ایک سبب تو وہ تھا جو جلی انداز میں بیان کر دیا گیا' یعنی آپؐ کی قرآن حکیم کے ساتھ غایت درجہ کی محبت اور اس کا حد درجہ شوق' جس کے نتیجے میں آپؐ نازل شدہ آیات قرآنی کو جلد از جلد یاد کر لینا چاہتے تھے تاکہ مزید وحی نازل ہو ـــــ لیکن آیت ۱۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے وحی قرآنی کو یاد کرنے کے لئے تیزی سے زبان مبارک کو حرکت دینے اور اس طرح شدید مشقت برداشت کرنے کا ایک دوسرا سبب بھی تھا' اور وہ یہ کہ آپؐ چاہتے تھے کہ آپؐ وحی کے الفاظ کو اچھی طرح یاد کر لیں' مبادا اس کا کوئی حصہ آپؐ کی یادداشت میں محفوظ نہ رہے اور اس طرح قرآن مجید کا کوئی لفظ یا کوئی آیت ضائع ہو جائے۔ چنانچہ آپؐ کی اس تشویش کو رفع کرنے کے لئے ارشاد فرمایا گیا : ﴿اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ﴾ "یقیناً ہمارے ذمے ہے اس (قرآن) کو جمع کر دینا بھی اور اس کا پڑھنا (یا پڑھوانا) بھی!"

وجوبِ حفاظتِ قرآن

یہ آیۂ مبارکہ جمع و ترتیب قرآن اور حفاظت متن قرآن کے ضمن میں قرآن حکیم کی اہم ترین آیت کی حیثیت رکھتی ہے' اس لئے کہ اگرچہ سورۃ الحجر کی آیت ۹ میں بھی حفاظت قرآن کے ضمن میں اللہ کا پختہ وعدہ وارد ہوا ہے کہ ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ○﴾ "یقیناً ہم نے ہی اس نصیحت اور یاد دہانی کو نازل فرمایا ہے اور خود ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں" لیکن یہ حقیقت بادنیٰ تامل واضح ہو جاتی ہے کہ اس موضوع پر قرآن کا ذروۂ سنام سورۃ القیامہ کی آیت ۱۷ ہی ہے' اس لئے کہ ایک تو اس میں حفاظت کی

مزید وضاحت دو الفاظ کے ذریعے کی گئی یعنی "جَمْعَهٗ" اور "قُرْاٰنَهٗ" اور دوسرے اس میں جو حرف جار "علٰی" وارد ہوا ہے (عَلَیْنَا) اس کا لازمی نتیجہ "وجوب" ہے' یعنی جمع و ترتیب قرآن اور حفاظت متن قرآن کو اللہ نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے' اور اگرچہ اہل سُنّت ایک کلامی اختلاف کے باعث اللہ تعالیٰ پر کسی چیز کا "وجوب" تسلیم نہیں کرتے' لہٰذا اس مقام پر اس سے مراد "وجوب" نہیں بلکہ "وعدہ" لیتے ہیں' لیکن ظاہر ہے کہ اس کا حاصل بھی وہی ہے' اسلئے کہ اللہ کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں دو بار یہ ارشاد فرمایا کہ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ۝﴾ (آل عمران : ۹ اور الرعد : ۳۱) "یقیناً اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا!" اور دو ہی بار یہ فرمایا کہ "اللہ ہرگز خلاف نہیں کرے گا اپنے وعدے کے!" (البقرہ : ۸۰ اور الحج : ۴۷) گویا اللہ تعالیٰ اور قرآن حکیم پر ایمان رکھنے والے کسی شخص کو قرآن مجید کے متن کی سالمیت اور محفوظیت کے معاملے میں ہرگز کبھی کسی قسم کا شک و شبہ لاحق نہیں ہو سکتا۔

جمع قرآن کے دو مراحل

اس آیہ مبارکہ میں جمع قرآن کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی جس ذمہ داری کا ذکر ہے اس کا اوّلین مصداق تو جمیع مفسرین و محققین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ نے قرآن مجید کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک میں جمع فرما دیا تھا۔ یہ تو ایک ایسی حقیقت ہے جس کے ضمن میں کسی کو کوئی اختلاف یا اشتباہ ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ جمع قرآن کے دوسرے مرحلے کے ضمن میں مختلف النوع شبہات لاعلمی کے باعث بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں پائے جاتے ہیں۔

جمع قرآن کا یہ مرحلہ ثانی قرآن مجید کو ایک کتابی شکل میں جمع کرنے کا تھا جو بالاجماع نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد طے پایا' اس لئے کہ اس پر اتفاق ہے کہ "مَا بَیْنَ الدَّفَّتَیْنِ" (جلد کے دو گتوں کے درمیان) قرآن کا ایک کتاب کی صورت میں جمع ہو جانا آنحضور ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے دوران نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت تک قرآن جس طرح نبی اکرم ﷺ کے سینہ مبارک میں جمع تھا اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد کے بھی صرف سینوں میں محفوظ تھا۔

اس مرحلہ ثانی کے بارے میں ایک بالکل غلط اور بے بنیاد بات تو وہ ہے جو خلیفۂ ثالث ذوالنورین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ قافیہ کی مناسبت سے "جَامِعُ آیاتِ القرآن" کے الفاظ چسپاں کر دینے کے باعث بہت بڑے حلقے میں پھیل گئی ہے' جس سے ذہنوں میں خواہ مخواہ یہ وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید قرآن کتابی صورت میں نبی اکرم ﷺ کے وصال کے کم از کم پندرہ بیس سال بعد جمع ہوا' اور یہ وسوسہ منطقی طور پر بہت سے شکوک و شبہات کو جنم دینے کا باعث بن جاتا ہے' جبکہ واقعہ اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ مصحف کی صورت میں قرآن مجید کے جمع ہو جانے کا مرحلہ تو دورِ خلافت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی میں' گویا نبی اکرم ﷺ کی وفات کے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سال کے اندر اندر' طے پا گیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے تو فی الواقع اُمت کو قرآن کے ایک رسم الخط پر جمع کیا تھا۔ گویا اگر قافیہ کی رعایت ہی ملحوظ رہے تب بھی اُن کی شان میں "جامِعُ الاُمَّۃِ عَلَی القُرآنِ" کے الفاظ زیادہ موزوں بھی ہیں اور مطابق واقعہ بھی!

سورتوں اور آیات کی ترتیب

جمع قرآن کے ضمن میں دوسرا بڑا وسوسہ اور مغالطہ آیات اور سورتوں کی باہمی ترتیب سے متعلق ہے' جس کے ازالے کے لئے اولاً تو لفظ "جَمْعَہٗ" ہی میں واضح اشارہ موجود ہے' اس لئے کہ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ قرآن کا جمع ہونا بغیر ترتیب کے ممکن نہیں ہے۔ ثانیاً اس کی مزید وضاحت و صراحت دوسرے لفظ یعنی "قُرْاٰنَہٗ" کے ذریعے کر دی گئی' جس کا ترجمہ "اس کا پڑھنا" بھی کیا جا سکتا ہے اور "پڑھوانا" بھی۔ لیکن اگر اس اصول کو پیش نظر رکھا جائے کہ "قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر و توضیح کرتا ہے" تو سورۃ الاعلیٰ کی آیت ۶ ﴿ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى ﴾ یعنی "ہم عنقریب آپ کو پڑھوا دیں گے تو آپ بھولیں گے نہیں" کے مطابق یہاں بھی زیادہ موزوں ترجمہ "پڑھوانا" ہی ہو گا۔ چنانچہ اگلی آیت مبارکہ یعنی ﴿ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴾ "تو جب ہم پڑھوائیں تو آپ اسی پڑھوانے کی پیروی کریں" مزید دلالت کر رہی کہ یہاں زیادہ زور اور تاکید ترتیب قرآنی کے بارے میں ہے' اس لئے کہ اولاً پڑھوانا لامحالہ کسی ترتیب ہی کے ساتھ ممکن ہے اور ثانیاً نبی اکرم ﷺ کو اسی ترتیب کی پابندی اور پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔

"قَرْاٰنَہٗ" میں "نا" ضمیر فاعلی جمع متکلم کے صیغہ میں موجود ہے اس کے بارے میں اگرچہ دو احتمالات موجود ہیں' یعنی ایک یہ کہ اس کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہو اور دوسرے یہ کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ہوں' لیکن بفحوائے آیاتِ قرآنی : ﴿ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾ (النساء:۸۰) "جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اصلاً اللہ ہی کی اطاعت کی" اور ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ﴾ (الفتح:۱۰) "یقیناً جو لوگ (اے نبیؐ) آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کر رہے ہیں"۔ ان دونوں احتمالات سے معنی اور مُراد میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ گویا فی الحقیقت تو اس پڑھوانے کا فاعلِ حقیقی اللہ سبحانہ وتعالیٰ خود تھا' لیکن مجازاً یا بالفعل یہ پڑھوانا حضرت جبرئیل علیہ السلام کا فعل تھا۔ چنانچہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ آنحضور ﷺ ہر رمضان مبارک میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کا دَور فرمایا کرتے تھے اور اپنی حیاتِ دُنیوی کے آخری رمضان المبارک میں آپؐ نے پورے قرآن کا دو مرتبہ دَور مکمل کیا' اور ظاہر ہے کہ نہ آپؐ کا یہ دَورۂ قرآن کسی ترتیب کے بغیر ممکن تھا' نہ ہی آپؐ کے صحابہؓ میں سے جو حضرات پورے قرآن کے حافظ تھے وہ بغیر کسی ترتیب کے حفظ کر سکتے تھے۔

غرضیکہ عقلاً اور نقلاً ہر اعتبار سے یہ بات مسلّم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو ایک خاص ترتیب سے نبی اکرم ﷺ کے سینہ مبارک میں جمع کیا اور اسی ترتیب کے ساتھ آنحضور ﷺ نے اُمت کو قرآن سکھایا اور یاد کرایا اور امانت خداوندی کو کامل دیانت کے ساتھ اُمت کے حوالے کر دیا' جیسے کہ آپؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا : ((تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ' كِتَابَ اللّٰهِ)) "میں چھوڑ کر جا رہا ہوں تمہارے مابین وہ چیز جسے اگر تم مضبوطی سے تھامے رہے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے' یعنی اللہ کی کتاب!"

غلط فہمی کا سبب

اس ضمن میں مغالطہ کا سبب یہ ظاہر و باہر اور متفق علیہ حقیقت ہے کہ قرآن کی ترتیب نزولی مصحف کی ترتیب سے بالکل مختلف تھی۔ لیکن اگر ترتیب نزولی اور ترتیب

مصحف کے فرق کی حکمت کو سمجھ لیا جائے تو شیطان کو کسی وسوسہ اندازی کا موقع نہیں مل سکتا۔

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن اللہ کا وہ کلام قدیم ہے جو ازل سے "لوح محفوظ" (البروج : ۲۲) یا "اُم الکتاب" (الزخرف : ۴) یا "کتاب مکنون" (الواقعہ : ۷۸) میں درج ہے' اور یہ وہ ابدی ہدایت نامہ ہے جو تاقیام قیامت تمام انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کفایت کرے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ ؎

"نوعِ اِنساں را پیامِ آخریں حاملِ اُو رحمۃ للعالمیں!"

اس کا نزول نبی اکرم ﷺ پر ایک خاص زمانے میں اور مخصوص حالات کے تناظر میں ہوا۔ اور یہ قرآن کا عظیم اعجاز ہے کہ اس کی آیات بینات ترتیب کے ذرا سے فرق کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے دوران بدلتے ہوئے حالات و واقعات پر اتنے معجزانہ طور پر چسپاں ہوتی چلی گئیں جیسا کہ وہ خاص اِن ہی حالات کے لئے نازل ہوئی ہوں' اور اِس طرح آنحضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنی دعوت و تحریک کے جاں گسل حالات و واقعات اور مسائل و مشکلات کے ضمن میں بروقت ہدایت و رہنمائی ملتی چلی گئی' جس سے آپؐ کے قلب مبارک کو بھی جماؤ اور ٹھہراؤ اور استقامت حاصل ہوتی چلی گئی اور آپؐ کے صحابہؓ کے دلوں کو بھی سہارا ملتا رہا اور ان کی ڈھارس بندھی رہی۔ چنانچہ یہی بات ہے جو سورۃ الفرقان کی آیت ۳۲ میں بیان ہوئی ہے کہ : ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝﴾ "اور کافروں نے کہا کہ ان پر قرآن ایک ہی مرتبہ پورا کیوں نہ نازل کر دیا گیا؟ (اس کا جواب یہ ہے کہ) ہم نے یہ اس لئے کیا کہ اس کے ذریعے (اے نبیؐ!) آپ کے دل کو جماؤ عطا فرمادیں' پس ہم نے اسے پڑھوایا تھوڑا تھوڑا کر کے!"

گویا ترتیب نزولی کی اصل حکمت یہ تھی کہ آپ ﷺ کی دعوت جن جن مراحل سے گزر رہی ہے اور آپؐ کی جِدّوجُہد کو جن جن موانع سے سابقہ پیش آ رہا ہے ان کی مناسبت سے آیات قرآنیہ نازل ہوتی چلی جائیں تاکہ آپؐ کو بروقت رہنمائی ملے اور ہر

مرحلے پر جو اعتراضات آپؐ پر کئے جائیں' یا جو سوالات و اشکالات آپؐ کے سامنے پیش کئے جائیں ان سب کا حل اور جواب ساتھ کے ساتھ ملتا چلا جائے' جبکہ ترتیب مصحف وقتی حالات کے تابع نہیں ہے' بلکہ لوحِ محفوظ' یا کتابِ مکنون' یا اُمّ الکتاب کے عین مطابق ہے اور اس کا اصل ہدف ابدی ہدایت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیات اور سورتوں کی اِس ازلی اور ابدی ترتیب میں غور و فکر کرنے والوں کو عظیم حکمتوں اور علوم و معارف کے نہ ختم ہونے والے خزانوں کا سراغ ملتا ہے اور اس سے علم و حکمت قرآنی کے نئے نئے گوشے روشن ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی وہ ترتیب ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو نبی اکرم ﷺ کے سینہ مبارکہ میں جمع فرمایا اور اسی کی پیروی اور پابندی کا آپؐ کے متبعین کو حکم دیا' اور یہی ترتیب اب ہمیشہ کے لئے دین میں حجت ہے!!

البتہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن مجید کو ایک کتاب کی شکل میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دَورِ خلافت میں اُس وقت مرتب اور جمع کیا جب جنگِ یمامہ میں بہت سے حُفّاظ صحابہؓ شہید ہو گئے اور اندیشہ ہوا کہ کہیں اِس طرح نوعِ انسانی قرآن سے محروم نہ ہو جائے۔ چنانچہ آں جنابؓ نے نبی اکرم ﷺ کے زمانہ مبارک کے جملہ کاتبینِ وحی کو جمع کر کے اور حضرت زیدؓ بن ثابت کو اُن کا ناظم اور سربراہ بنا کر اس کمیٹی کے سپرد یہ کام کیا کہ قرآن مجید کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کر لیں۔ چنانچہ پورا قرآن کریم جو حفاظِ کرام کے سینوں میں محفوظ تھا اور جس کے بعض اجزاء اور مختلف سورتیں بعض صحابہؓ کے پاس تحریری شکل میں بھی موجود تھیں' ان سب کی مدد سے قرآن مجید کو "بَیْنَ الدَّفَّتَیْنِ" یعنی جلد کے دو گتوں کے درمیان کتابی شکل میں جمع کر لیا گیا۔

البتہ اس کے پڑھنے میں اہل عرب کے مختلف لہجے تھے۔ اُردو زبان کے بھی مختلف لہجے ہیں' چنانچہ لکھنوی لہجہ اور ہے اور دہلی کا لہجہ اور' اسی طرح حیدر آبادی لہجہ جدا ہے اور بہاری لہجہ جدا' اور ابتداءً لوگوں کی سہولت کے لئے انہیں قرآن مجید کو اپنے اپنے لہجوں میں پڑھنے کی اجازت تھی' لہٰذا مختلف لہجوں کا اثر قرآن کریم کی کتابت و قراءت میں بھی آ رہا تھا ـــــ چنانچہ اُمت پر یہ احسان عظیم حضرت عثمان ذوالنورین رضؓ کا ہے کہ آپؓ نے اپنے دورِ خلافت میں اُمت کو قرآن کے ایک رسم الخط پر جمع کیا۔ گویا آنجنابؓ قرآن کریم کو جمع کرنے والے نہیں ہیں بلکہ اُمت کو قرآن کی ایک کتابت پر جمع

کرنے والے ہیں۔

الغرض سورۃ القیامہ کی یہ دو آیات ﴿ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ○ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ○ ﴾ یعنی "(اے نبیؐ!) ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا بھی اور اس کا پڑھوانا بھی' تو جب ہم اسے پڑھوائیں تو آپؐ اس کو اسی ترتیب سے پڑھئے۔" حفاظت متن قرآن اور جمع و ترتیب قرآن کے ضمن میں قرآن کا ذروۂ سنام ہیں۔

اس کے بعد آیت ۱۹ میں فرمایا : ﴿ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ ○ ﴾ "پھر ہمارے ہی ذمے ہے اس کی تبیین یعنی توضیح و تشریح" ـــــ یہ بات بھی نہایت اہم ہے' اور جس طرح جمع قرآن کے دو مرحلے تھے' اسی طرح اس کے بھی دو حصّے ہیں' جن کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ چنانچہ ایک حصّہ تو یہ ہے کہ جب قرآن مجید میں نازل شدہ احکام کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں کچھ سوالات پیدا ہوتے تھے تو بعد میں توضیحی آیات نازل ہو جاتی تھیں' ایسی آیات بعض اوقات تو اُسی حکم کے ساتھ متصلاً درج کر دی گئی ہیں' بعض اوقات انہیں کسی قدر فصل کے ساتھ درج کیا گیا ہے' اور بعض اوقات سورۃ کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ رمضان کے روزوں کے بارے میں تفصیلی احکام پر مشتمل آیت سورۃ البقرۃ کے اسی تیئسویں رکوع کے آخر میں شامل کر دی گئی جس میں ابتدائی حکم درج ہے' جبکہ دوسری اور تیسری صورتوں کی نمایاں مثالیں سورۃ النساء میں موجود ہیں۔ ایسی توضیحی آیات کے ساتھ آپ اکثر دیکھیں گے کہ یہ الفاظ آتے ہیں ﴿ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ﴾ "اسی طرح اللہ اپنی آیات کی تبیین اور وضاحت فرما دیتا ہے۔"

الغرض ایک تو تبیین قرآن یعنی قرآن مجید کی مزید تشریح و توضیح کی صورت یہ ہے کہ وہ خود قرآن ہی کے ذریعے ہو گئی۔ اس کے علاوہ اس کا ایک دوسرا نظام بھی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرضِ منصبی قرار دیا گیا کہ آپؐ قرآن مجید کی تشریح و توضیح اور تبیین فرمائیں۔ چنانچہ سورۃ النحل کی آیت ۴۴ میں فرمایا : ﴿ وَ اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ﴾ "(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ پر یہ الذکر (یعنی قرآن) نازل فرمایا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لئے وضاحت کریں اُس چیز کی جو ان کے لئے نازل کی گئی ہے" ـــــ گویا قرآن مجید کی توضیح و تبیین کی ایک صورت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت خصوصی یا وحی خفی پر مبنی سنّتِ رسولؐ کے ذریعے

سامنے آئی۔ اس سلسلے میں کچھ کج فہم اور گم کردہ راہ لوگوں کا یہ اِشکال بالکل بے بنیاد ہے کہ اگر قرآن پر سُنّت رسولؐ کا اضافہ کیا جائے تو یہ قرآن کی توہین ہے اور اِس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مکمل نہیں ہے اور وہ اپنی وضاحت کے لئے سُنّت کا محتاج ہے۔ معاذ اللہ' کوئی صاحب ایمان قرآن کے متعلق ہرگز یہ تصور اور خیال نہیں رکھتا کہ قرآن سُنّت کا محتاج ہے' البتہ تمام مسلمانوں کا اجماعی و متفق علیہ مؤقف یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو سمجھنے اور اس کی رہنمائی پر عمل پیرا ہونے کے لئے سُنّت رسولؐ کے محتاج ہیں۔ گویا یہ احتیاج ہماری ہے کہ ہم فہم قرآن اور عمل بالقرآن کے لئے نبی اکرم ﷺ کے اَقوال اور اَفعالِ مبارکہ کو اپنے سامنے رکھیں اور دیکھیں کہ حضور اکرم ﷺ نے قرآن مجید پر کس طرح عمل کر کے دکھایا ہے اور تعلیماتِ قرآن کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے دائروں میں کس طرح بالفعل نافذ کیا اور اس طرح اس کا عملی نمونہ پیش فرمایا۔ اس لئے کہ اسی کے حوالے سے ہم قرآن مجید کو صحیح طور پر سمجھ بھی سکیں گے اور اِس پر عمل بھی کر سکیں گے' اور سُنّت کی یہ تبیین بھی حکماً ہدایتِ قرآن ہی کا حصّہ ہوگی' اس لئے بھی کہ اس تبیین قرآن کا حکم اللہ ہی نے آپؐ کو دیا ہے ـــــ اور اس لئے بھی کہ قرآن حکیم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے متعدد کاموں کو صراحتاً اپنی طرف منسوب فرمایا ہے' جس کی ایک نمایاں مثال سورۃ الانفال میں وارد ہوئی ہے کہ غزوۂ بدر میں نبی اکرم ﷺ نے کنکریوں کی مٹھی بھر کر کفار کی طرف پھینکی تو اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ﴾ "(اے نبی!) جب آپؐ نے کنکریاں پھینکی تھیں تو آپؐ نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں"۔ علامہ اقبال نے اسی بات کو یوں تعبیر کیا ہے ؎

گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

الغرض ـــــ معانی و مطالب قرآن کی وضاحت کا ذمہ بھی از روئے آیہ مبارکہ اللہ نے خود لیا تھا ـــــ جو کچھ تو خود قرآن حکیم کی توضیحی آیات کے ذریعے پورا ہوا اور اکثر و بیشتر سُنّتِ رسول ﷺ کے ذریعے پورا ہوا۔

بَارَكَ اللّٰهُ لِيْ وَلَكُمْ فِي الْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ وَنَفَعَنِيْ وَاِيَّاكُمْ بِالْاٰيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ○○

مرکزی **انجمن خُدّامُ القُرآن** لاھور

کے قیام کا مقصد

مَنبع ایمان —— اور —— **سرچشمۂ یقین**

قرآنِ حکیم

کے **علم و حِکمت** کی

وسیع پیمانے —— اور —— اعلیٰ علمی سطح

پر **تشہیر و اشاعت ہے**

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اِسلام کی **نشأۃِ ثانیہ** — اور — **غلبۂ دینِ حق** کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ